اپنی آگ

شاکر کریمی

یہ کتاب بہار اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی

مہتمم
ایم. نسیم اعظمی

سرورق : نیاز الدین نیازی. سیتا مڑھی
خطاط : انور جمال. بنارس
طابع : نکھار پرنٹنگ پریس (عکسی) مئو
قیمت : اٹھارہ روپے

تعداد : ایک ہزار
صفحات : ۱۶۸
طبع اوّل : دسمبر ۱۹۷۹ء
سلسلۂ مطبوعات : اوّل

مصنف کا پتہ
گنج نمبر ا. بتیا. مغربی چمپارن (بہار)

تقسیم کار

ملنے کے پتے
:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ. جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵. دہلی. علیگڑھ. بمبئی
:- دانش محل. امین الدولہ پارک. لکھنؤ
:- بک امپوریم. سبزی باغ. پٹنہ ۴
:- ایجوکیشنل بک ہاؤس. مسلم یونیورسٹی مارکیٹ. علیگڑھ

والدہ محترمہ

کے نام

جن کی بے انتہا شفقتوں نے مجھے ادبی شعور عطا کیا

*

شاکر کریمی

ترتیب

افسانے

فن اور فنکار

ادب سماج کا درپن اور فنکار کا آئینۂ فن ہے جس میں حالات و حادثات اور خیالات و احساسات کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ادیب و شاعر آپ بیتی کی شراب کو جگ بیتی کے ساغروں میں ڈھال کر میکشانِ علم و ادب کے حضور پیش کر دیتا ہے۔ اپنی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے رند دونتے کیف و سرور حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اس فن کے لئے بڑی مشق و مہارت کی ضرورت ہے۔ زبان و بیان کے ساتھ ہی مسائلِ حیات و کائنات پر فنکار کو پوری دسترس اور واقفیت ہونا چاہیئے۔

چند دنوں سے جدیدیت کے نام پر زبان و ادب کا مزاج بگاڑا جا رہا ہے۔ غیر مانوس اور الجھا ہوا اندازِ نگارش اختیار کر کے غیر تربیت یافتہ لوگ اردو کے ادبِ عالیہ کی نفاست و فصاحت پر طنز کر رہے ہیں لیکن اس بے راہ روی کے دور میں بھی ایسے فنکار موجود ہیں جو پوری ادبی ذمہ داریوں کے ساتھ اپنی فنکارانہ صلاحیتیں گیسوئے زبان و ادب کی شانہ کشی میں صرف کر رہے ہیں۔ حضرت شاکر کریمی کا شمار بھی انھیں قلمکاروں میں ہے جن کی تابشِ فکر آئینۂ ادب کو جلا بخش رہی ہے۔

شاکر کریمی نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ میں نے ان کی تخلیقات ملک کے معیاری جرائد میں پڑھی ہیں اور ان سے متاثر ہوا ہوں۔

شاکر کریمی ایک بالغ نگاہ شاعر اور باصلاحیت افسانہ نگار کی حیثیت سے پوری دنیائے ادب میں پہچانے جاتے ہیں اور اس منزل کی جانب تیزی سے گامزن ہیں جہاں پہنچکر فنکار اپنے نقوش تاریخ کے صفحات پر ابھار تا ہے ان کا اندازِ نگارش سادگی و پرکاری کا حسین سنگم ہے۔ ان کے قلم کی آہٹوں میں دورِ حاضر کا دل دھڑکتا ہے۔ ان کا خلوص اور اپنا پن حقیقی ہے۔ شاکر کریمی کے یہاں طلسماتی ماحول نہیں بلکہ یہ انسانی جذبات و احساسات کی اصلی تصویریں بنا کر ہر صاحب عقل و دانش اور باشعور آدمی کو اپنے سے قریب کرتے ہیں۔ یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔

حیات وارثی

جنرل سکریٹری آل انڈیا ہندی اردو سنگم لکھنؤ ۲

شاکر کریمی
فنکاروں کی نظر میں

★

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ بہار اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے جناب شاکر کریمی کے افسانوں کا مجموعہ "اپنی آگ" ۔ ان سے شائع ہو رہا ہے۔

اب تک افسانہ نگار "اپنی آگ" میں خود جلتے رہے ہیں لیکن اس کی اشاعت کے بعد دوسروں کو بھی اس آگ میں جلنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ شاکر صاحب اپنے افسانوں میں اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا موضوع زندگی کا وہ پہلو ہے جس سے انسانی کرب و اضطراب عبارت ہے۔ یہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں اپنے فن کے ذریعہ قاری کو ذہن نشیں کرانا چاہتے ہیں۔ ان کے یہاں زبان و بیان کی سادگی و صفائی بھی ہے اور فنکارانہ چابک دستی بھی۔

شاکر صاحب زندگی کے گوناگوں مسائل کے مطالعہ و مشاہدہ میں عقل و شعور سے کام لیتے ہیں۔ یہی ان کے فن کی عظمت ہے جو زندگی کے تجزیہ و تنقید میں ان کی رہنمائی کرتی ہے۔

ڈاکٹر ایم۔ کلیم سہسرامی ایم۔اے، ڈی لٹ (تہران)
صدر شعبۂ السنہ، راجشاہی یونیورسٹی
راجشاہی (بنگلہ دیش)

★ کہانی لکھنا میرے نزدیک ایک تخلیقی یا سماجی عمل سے پہلے ایک ذاتی اظہار کا عمل ہے کسی بھی حساس شخص کے لئے اس کی ذات کا اظہار اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ایسا کر کے ہی وہ اپنے ذہن پر پڑے ہوئے بوجھ کو تھوڑا سا ہلکا کر لیتا ہے اور یہی اظہار آگے چل کر اس کے اندر تخلیقی اعتماد اور سماجی ذمہ داری کا ایک ایسا احساس پیدا کر دیتا ہے جو اس کے فن کو سنوارنے میں قدم قدم پر ساتھ دیتے ہیں۔

شاکر کریمی نے اب تک جتنا کچھ لکھا ہے وہ ان کے اظہارِ ذات، تخلیقی جستجو اور سماجی

شعور کا ہی آئینہ دار ہے۔

رام لعل

II/۲۹ آر ملٹی اسٹوری۔ چارباغ۔ لکھنؤ

---

* آج کے سود و زیاں کے دور میں جہاں کوئی کسی کی جانب بغیر مطلب کے نگاہ بھی نہیں اٹھاتا، وہاں یہ امر بہت غنیمت ہے کہ بعض سرپھرے بہتر انسانی قدروں کی کھوج میں خواہ مخواہ اوروں کے دکھ اپناتے رہیں ـــــ فنی تخلیق و تصنیف کا عمل بھی اوروں کی زندگی کرنے سے عبارت ہے۔

شاکر کریمی گذشتہ کئی برسوں سے بڑی محبت اور انہماک سے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ تصنیف میں ایسی ہی بے چین شرکتوں سے مصنف اپنے منصب سے عہدہ برآ ہو پاتا ہے۔ شاکر کریمی کا فن پیہم رو بہ ارتقا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اپنی مسلسل ریاضت کے باعث بالآخر وہ اپنی اس کھوئی ہوئی کہانی کو ڈھونڈ ہی نکالیں گے جس کی تلاش میں وہ اتنے طویل سفر پر نکلے ہوئے ہیں ـــ ہم سب لکھنے والوں کو ہمہ دم اسی ایک گمشدہ کہانی کی تلاش ہوتی ہے۔

جوگندر پال

ای۔ ۵۸۷۔ گریٹر کیلاش ۲ نئی دہلی ۴۸

---

* شاکر کریمی نہایت ہوشمند افسانہ نگار ہیں۔ عرصہ سے معیاری رسائل میں شاکر صاحب کے افسانے شائع ہو رہے ہیں اور قارئین ان کو پسند کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "پر ترے جب اٹھ گئے" ۱۹۶۴ء میں چھپ چکا ہے۔ اب بہار اردو اکادمی نے شاکر صاحب کا دوسرا مجموعہ "اپنی آگ" شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

شاکر صاحب معاشرے اور زندگی کے مسائل کو سمجھ کر اپنی تخلیقات میں ان کی عکاسی کرتے ہیں۔ انسانیت کی فلاح اور انسان کی عظمت کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کے افسانوں کی زبان صاف اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ جزئیات نگاری کے اچھے نمونے بھی ان کے

یہاں ملتے ہیں۔

میری رائے میں عہد حاضر کے دیدہ ور فنکاروں میں شاکر صاحب نمایاں مقام کے مالک ہیں۔ یقین ہے کہ "اپنی آگ" کا اردو کے حلقوں میں پرجوش خیر مقدم کیا جائے گا۔

کوثر چاند پوری

ہمدرد نرسنگ ہوم۔ آصف علی روڈ۔ نئی دہلی

---

* اردو افسانہ کئی موڑوں سے گزر کر اب عوام کے اتنا قریب آچکا ہے کہ اس میں ایک عام انسان اپنے احساسات، جذبات اور مسائل کی بھرپور تصویر دیکھ سکتا ہے۔

اتنے طویل ارتقائی پروسیس میں جن اردو افسانہ نگاروں نے اپنی کوششیں جاری رکھی ہیں ان میں شاکر کریمی کا نام قابلِ ذکر ہے۔

شاکر کریمی نے "پردے جب اٹھ گئے" کے ساتھ جن توقعات کی پرچھائیاں ابھاری تھیں اب وہ واضح اور روشن پیکروں میں ڈھل کر "اپنی آگ" کی شکل میں عوام تک پہنچ رہی ہیں۔

"اپنی آگ" کی ہلکی ہلکی آنچ یقیناً ان ذہنوں کو گرمائے گی جنھیں اپنے ماحول کی سرد مہری سے شکایتیں ہیں۔

کشمیری لال ذاکر

۱۳۶ اسیکٹر ۱۹ اے۔ چنڈی گڑھ (پنجاب)

---

* مختصر افسانے کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ افسانہ نگار اپنی تخلیق کے لئے وہی موضوع و مواد استعمال کرے جس سے کہ اسے اچھی طرح جانکاری ہو۔ وہی لکھے جو اپنے گرد دیکھے اور محسوس کرے۔ شاکر کریمی اپنے افسانوں کے لئے خام مال اپنے آس پاس سے لیتے ہیں اس لئے ان کے افسانے ہمیشہ کامیاب افسانے بنتے ہیں۔ وہ ادب برائے مقصدیت کے قائل ہیں اور ان کے افسانوں میں اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا ہے لیکن یہ اپنی بات کچھ اس خوبی سے کہہ جاتے ہیں کہ کہیں بھی تبلیغ کا احساس نہیں ہوتا۔ عام بول چال کی ہلکی پھلکی اور سلیس زبان کا استعمال ان کی کامیابی کا دوسرا راز ہے۔ ان کے افسانوں میں اندازِ بیان اور مکالموں کی بے ساختگی پڑھنے والوں کی توجہ اس حد تک اپنی طرف کھینچ لیتی ہے کہ ایک بار شروع کرنے کے بعد قاری افسانے کو ختم کئے بنا نہیں رہ سکتا اور یہ شاکر کریمی کے فن کا طرۂ امتیاز ہے۔

ڈاکٹر بشیشر پردیپ ایم۔ایس سی، پی ایچ ڈی

۱۸ ا۔ گلستاں کالونی۔ لکھنؤ

میں اور میرے افسانے

..... جب میں صرف امتیاز احمد تھا، خود سے بے خبر، اپنی ذات اور اپنی ذات کی گہرائی سے ناواقف تو زندگی سیماب تھی، کبھی یہاں، کبھی وہاں، کبھی کچھ تو کبھی کچھ۔ نہ کسی تخلیقی عمل سے آشنا، نہ کچھ پانے کی فکر نہ کچھ کھونے کا غم۔ لیکن جب ذہن کی آنکھیں روشن ہوئیں، شعور کی بالیدگی کا احساس ہوا، سوچنے اور سمجھنے کا انداز بدلا تو کچھ کرنے، کچھ کر گزرنے کی مسلسل فکر نے مضطرب کر دیا، اور تب میرے اندر کہیں چھپا ہوا شاکر کریمی باہر آنے کے لیے کسمسانے لگا۔

.... ماحول کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ میں اپنی ذات کی گہرائی میں اتر کر اسے باہر لے آؤں، جو نہ صرف انسانی مسائل، سماجی انتشار اور نفسیاتی الجھنوں کی نشاندہی کرے، بلکہ میری اپنی شخصیت کے پُر اثر اظہار کا بھی بہترین ذریعہ ثابت ہو۔

اور پھر ـــ میرے اندر چھپے شاکر کریمی کے باہر آتے ہی زندگی کی بساط پر ہر سمت بکھرے ہوئے مختلف انداز کے افسانے انسانی مسائل، سماجی انتشار اور نفسیاتی الجھنوں کی آگ میں سلگنے۔ ان گنت جیتے جاگتے کردار مل کو اپنے آپ میں سمیٹے الفاظ کی صورت نوکِ قلم سے ٹپک کر صفحۂ قرطاس پر بکھر گئے۔

لیجیے، "اپنی آگ" کی دھیمی دھیمی آنچ میں سلگتے کرداروں پر مشتمل ان افسانوں میں سے چند افسانے آپ کے سامنے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے اور ان افسانوں سے متعلق اپنے گراں قدر مشوروں سے مجھے مطلع فرمائیے، یقین جانئے آپ کے مشورے میرے لیے مشعلِ راہ ہوں گے اور اس مشعل کی روشنی میں میں اپنی اس منزل کو پا لینے کی سعی کروں گا جس کی تلاش میں تخلیق و تصنیف کے طویل سفر پر نکل پڑا ہوں........

شاکر کریمی

بتیا - مغربی چمپارن (بہار)

منظر، اور نریش، اسلم کے ساتھ اس کی نئی فیاٹ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ میں اور رضا پچھلی خالی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے بڑھے ہی تھے کہ کار نے ایک جھٹکا لیا، داہنی طرف کچھ مڑی، پھر سیدھی ہو کر کشادہ اور چکنی سڑک پر ٹریفک کے ہجوم میں لہراتی بل کھاتی ہم سے دور ہو گئی۔ ہم دونوں فٹ پاتھ پر ہی کھڑے رہ گئے۔ میرا دل دھڑکنے لگا، سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ تیز اور خنک ہواؤں کے باوجود مجھے اپنی پیشانی پر نمی کا احساس ہونے لگا۔

میں حیرت و یاس کا پیکر بنا رضا کو دیکھ رہا تھا اور رضا جاتی ہوئی کار کو، جو اب ایک سرخ نقطہ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا یہ چہرہ رضا کا وہ اپنا چہرہ نہیں ہے، جو کچھ ہی دیر پہلے تھا۔

میں رضا کو برسوں سے جانتا ہوں، اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اس کے مزاج سے، عادات و اطوار سے خوب واقف ہوں، میں نے اسے مختلف انداز میں، مختلف رنگ میں دیکھا ہے، میں اس کے اپنے چہرے سے بھی متعارف ہوں اور چہرے کے بدلتے ہوئے تیور اور بدلتے ہوئے رنگ سے بھی روشناس ہوں۔

میں نے رضا کے چہرے کو بھٹی کی طرح سلگتا ہوا اور دہکتا ہوا بھی دیکھا ہے اور چاند کی طرح شیتل اور پھول کی طرح شگفتہ بھی۔ آگ برساتے ہوئے سورج کے نیچے تپتے ہوئے ریگستان کی طرح بھی بے آب و گیاہ، اور چناروں کے خنک سایے میں پر سکون جھیل کی طرح بھی، فرشتہ صفت معصوم بچے کی طرح کھلکھلا کر ہنستے اور قہقہے لگاتے ہوئے بھی اور کسی مظلوم کی طرح اداس اور مضمحل بھی ——

— لیکن اس وقت مجھے رضا کا چہرہ عجیب لگ رہا تھا، نہ تو بھٹی کی طرح سلگتا اور دہکتا ہوا، اور نہ چاند کی طرح شیتل اور پھول کی طرح شگفتہ، تپتے ہوئے ریگستان کی طرح نہ چناروں کے خنک سایے میں پر سکون جھیل کی طرح، فرشتہ صفت معصوم بچے کی طرح اور نہ کسی مظلوم کی طرح۔ ہاں اگر کچھ نظر آ رہا تھا تو وہ خون تھا۔ صرف خون جیسے اس کے جسم کا سارا خون کھینچ کر چہرے پر آ کر جم گیا ہو۔ میرے اندر جھرجھری سی ہونے لگی، میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ رضا نے میرے بائیں بازو کو اپنے داہنے ہاتھ کی مضبوط انگلیوں کی گرفت میں لے لیا، میں سمجھ نہ سکا، رضا نے میرے اندر کی کیفیت کا اندازہ لگا کر مجھے سہارا دیا ہے یا خود میرا سہارا لیا ہے۔ اس نے ایک لمبی سانس لی تو میں نے اس کی طرف دیکھا، خون کی ایک تیز لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ رضا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، کرب میں ڈوبی ہوئی۔

ہم چل پڑے، اس طرف جس طرف کار گئی تھی، ہمیں بھی وہیں جانا تھا جہاں منظر، نرگس اور اسلم گئے تھے، نئی خیاٹ کالونی۔ سلطان زیدی کے یہاں، زیدی نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ کے فائنل امتحان میں کامیابی حاصل کر لی تھی، اور اپنی کامیابی کی خوشی میں اس نے شاندار پارٹی کا اہتمام و انتظام کیا تھا —— ہمارے قدم بوجھل تھے۔ دلوں پر بھی بوجھ سا تھا، زبانیں بھی خاموش تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم زیدی کی خوشی میں شریک ہونے نہ جا رہے ہوں، بلکہ اپنے کسی عزیز کو دفن کر کے قبرستان سے لوٹ رہے ہوں۔"

رضا حسب معمول پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا —— رضا جب بھری پری سڑکوں پر چلتا ہے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، جیسے ہر قدم انتہائی احتیاط کے ساتھ رکھ رہا ہے، جیسے اسے ڈر ہو کہ آگے بڑھنے والا قدم کہیں دلدل پر نہ پڑ جائے، کسی غلاظت پر پڑ کر پھسل نہ جائے، راستہ چلتے ہوئے دائیں بائیں اور سامنے دیکھتا ہوا چلتا ہے۔ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیا کرتا ہے۔ ایک دن

میں اس نے پوچھا تھا۔

"تم راستہ چلتے ہوئے گھبرائے گھبرائے ہوئے سے کیوں لگتے ہو؟ خود کو سمٹے سمٹے سے کیوں رہتے ہو؟" — اس نے ایک بڑی ہی تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

"یہ وید، بائبل اور قرآن کا دور نہیں، ٹکنالوجی اور بائیولوجی کا دور ہے ایٹم، راکٹ اور مشینوں کا دور ہے۔ جدت پسندی کا دور ہے، تمام قدریں تیزی سے جدید سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہیں، چاند ستاروں پر کمندیں ڈالی جا رہی ہیں، آج کا انسان تیز رو مشین سے کم نہیں، غور و فکر کا انداز بھی مشینی ہے جس میں صرف اپنا ہی مفاد وابستہ ہے، کیا پتہ تیز بھاگتی ہوئی دنیا کا کوئی فرد کب گلے پر ہاتھ ڈال دے کہ کوئی چمکتا ہوا خنجر یا کوئی آہنی گولی کسی طرف سے لہراتی ہوئی آئے اور جسم کے کسی حصے میں محفوظ ہو جائے، کیا پتہ کوئی سائیکل یا موٹر سائیکل تیز روی کے اس دور میں کسی موڑ پر ٹکر مار دے! اور اپنی تیز روی پر نادم ہونے کے بجائے میرے ٹوٹتے ہوئے ہاتھ پاؤں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے "سالا دیکھ کر نہیں چلتا" کہتا ہوا، شان بے نیازی سے گذر جائے، ممکن ہے کوئی برق رفتار کار یا ٹرک روندتا ہوا اس طرح آگے بڑھ جائے جیسے میں نے اس سے کہا ہو "اے بھائی! مجھے زندگی کی قید سے آزاد کرتا جا" اور کچھ نہیں تو سامنے سے آتی ہوئی کوئی جوان لڑکی یا عورت ہی گریبان پکڑ کر شور مچا دے کہ "اے لوگو دیکھو! اس کی نظریں میری کھلی ہوئی ناف کی گہرائی کو نہیں ناپتیں، اس کی نگاہیں میرے دیدہ زیب جسم کے نمایاں نشیب و فراز کو نہیں ٹٹولتیں" اور لوگ اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے مجھ پر برس پڑیں، بد ذوق، بے حس، نامرد، اور کوئی اس لڑکی یا عورت سے یہ کہنے کی بھی زحمت نہ کرے کہ "اے بنتِ حوا! تو خود کو اس طرح نمایاں کر کے گھر سے باہر کیوں نکلتی ہے، ایک تماشہ بن کر؟" رضا نے کہا تھا کہ اب تو ایسا لگتا ہے کہ میں خود کو بچائے رکھنے کی کوشش میں سبھوں سے کٹ گیا ہوں

تنہا ہو گیا ہوں۔"

ہم مارکیٹ روڈ سے گذر رہے تھے، دونوں طرف چھوٹی بڑی چھجاتی ہوئی روشنیوں میں ڈوبی ہوئی دوکانیں تھیں۔ دوکانوں پر گاہکوں کی بھیڑ تھی، فٹ پاتھ پر آنے جانے والوں کا ہجوم تھا، سڑک پر ٹریفک کی آمدورفت تھی، ہر طرف شور شرابہ تھا، ہنگامہ تھا، اور میں محسوس کر رہا تھا، اس ہنگامے کے باوجود ہمارے گرد گہری خاموشی ہے، بہت ہی گہری، موت کی سی، جیسے ہمارا وجود بھی تحلیل ہو کر اس خاموشی کا ایک جز بن گیا ہو، اور جیسے فضا میں بارود ہی بارود بھری ہو، بس کچھ بولا تو میری آواز بٹن پر انگلی رکھنے کا کام کرے گی، اور پھر سب کچھ بھک سے اڑ جائے گا۔ میں نے رضا کی طرف دیکھا، اس کے چہرے کے تناؤ میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ جیسے غبارے میں اس کے حجم سے زیادہ ہی ہوا بھر دی گئی ہو۔ اور جس کے ہلکے سے جھٹکے پر پھٹ جانے کا خطرہ ہو۔ میں نے سوچا، رضا مجھ سے آگے بڑھ کر سوچ رہا ہو گا۔ اس لیے کہ یہ بہت سوچتا ہے اور جب یہ سوچنے لگتا ہے تو اس کا سوچنا ہی میرے لیے سوچنے کا موضوع بن جاتا ہے، اور جب یہ سوچنے کے موڈ میں نہیں ہوتا ہے تو ماحول بالکل ہلکا پھلکا سا لگتا ہے، جیسے سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا ہونا چاہیے، جیسا یہ چاہتا ہے، جیسا میں چاہتا ہوں، جیسا ہم چاہتے ہیں۔"

ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ دوستوں نے رضا کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا، لیکن رضا نے اپنے بارے میں ایک پل بھی سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی، بالکل مطمئن تھا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ہوا یہ تھا کہ ایک شام رضا رام نگر سے اپنے شہر واپس آ رہا تھا کہ ایک چھوٹے اسٹیشن پر ٹرین مجسٹریٹ چیکنگ کے نرغے میں آ گئی، اس کے اپنے کمپارٹمنٹ میں ایک نوجوان، قبول صورت سیدھی سادی دیہاتی لڑکی کی کلائی جب سی، آر، پی کے ایک سنگدل سپاہی

کی سخت ہتھیلی میں جکڑ گئی تو لڑکی کا خوف سے لرزنا، آنسو بہانا، منت سماجت کرنا۔ اور سپاہی کی زباں درازیاں اور اس کی بڑی بڑی تنی ہوئی مونچھوں کے اوپر بے رحم آنکھوں سے درندگی کا جھانکنا، رضا سے دیکھا نہ گیا۔ رضا نے چپکے سے اپنا ٹکٹ لڑکی کو تھما دیا، اور خود کو سپاہی کے حوالے کر دیا، اور پھر بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں جرمانہ کی ڈیڑھ سو کی رقم ادا کرنے کے لیے اسے اپنی ڈھائی سو روپے کی گھڑی سے محروم ہونا پڑا تھا، یہ خبر جب دوستوں تک پہونچی تو دوستوں نے بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا مجرم قرار دیتے ہوئے اس کی خوب تذلیل کی تھی۔ جی بھر کے اس کا مذاق اڑایا تھا۔ اور رضا نے ہنستے ہوئے دوستوں کے طعنوں کو، زہریلے فقروں کو اور طنز کے تیروں کو سہہ لیا تھا۔ میرے استفسار پر اس نے کہا تھا۔

”مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ دوستوں کی نظروں میں حقیر اور ذلیل سمجھا جانے لگا ہوں، اس کی فکر نہیں کہ دنیا کی نظروں میں گر گیا ہوں، بلکہ میں خوش ہوں کہ میں نے اپنے آپ کو اپنی نظروں میں نہیں گرنے دیا ــــ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے وہی کیا ہے جو مجھے کرنا چاہیئے“ رضا نے کہا۔

”تم خود سوچو کیا اس رات وہ مجبور، بے سہارا اور غریب لڑکی سی۔ آر۔ پی والوں کے ظلم و تشدد کی تاب لا سکتی تھی؟“ میرا سر رضا کے سامنے جھک گیا تھا۔

مجھے وہ شام بھی اچھی طرح یاد ہے جب ایک مباحثہ کی محفل میں رضا کے علم اور فکر کی بلندیوں تک نہ پہونچ کر ہمارے ایک اچھے دوست نے اس پر دشنام طرازیوں کی بوچھار کر دی تھی اور رضا دوست کے غلاظتوں سے بھرپور جملوں کے جواب میں مسکراتا رہا۔ مجھے رضا کے صبر و ضبط پر حیرت ہوئی تھی تو رضا نے میری حیرت کو دور کرتے ہوئے کہا تھا۔

”گالیوں کا جواب گالیاں ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو دونوں میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ کسی سے بھی بھیس وہی ملے گا جو اس کے پاس ہے۔ اور گالیاں تو ذہنی دیوالیہ پن کی دلیلیں ہیں، اس بات کا واضح ثبوت کہ فریق سب کچھ ہار چکا ہے“

رضا جب کسی موضوع پر بولتا ہے تو میں اس کی باتیں اس طرح سنتا ہوں جس طرح کوئی اپنے پیرو مرشد کی باتیں سنتا ہے۔ میں چاہتا تھا رضا کچھ بولے، کچھ کہے، تاکہ راستہ کٹے، اور کچھ دیر پہلے ہم جس غیر اخلاقی حادثہ سے دو چار ہوئے ہیں اس سے فرار حاصل کر سکیں، اس کو بھول جانے یا نظر انداز کر دینے کی سعی کریں۔ میں نے سوچا میں ہی کچھ بولوں، لیکن ایسا محسوس ہوا جیسے آغازِ سخن کے لیے میرے پاس نہ الفاظ ہوں اور نہ کوئی بات، اور رضا تو ایسا خاموش تھا جیسے اب بولنے کا ہی نہیں، لیکن جب گہری خاموشی کا بوجھ دل پہ ناقابلِ برداشت ہو گیا اور دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا، اور راستہ طویل اور اذیت ناک معلوم ہونے لگا، تو میں نے سوچا، انجام خواہ کچھ بھی ہو، دل کی بھڑاس نکلے یا نہ نکلے، مجھے کچھ نہ کچھ بولنا ہی چاہیے، میں نے بڑی مشکل سے خود کو بولنے پر آمادہ کیا۔

"ہم پانچوں کے درمیان یہی تو طے پایا تھا کہ کافی ہاؤس میں جمع ہوں گے اور وہیں سے ایک ساتھ زیدی کے یہاں چلیں گے!"

"ہوں!" رضا نے اس طرح ہوں کہا جیسے سلگتی ہوئی لمبی سانس کے درمیان ایک دل سوز آہ اس کے سینے سے نکلی ہو۔ ـــ میں نے کہا

"ہمارے جسموں پر قیمتی اور نفیس سوٹ نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے اس وجہ سے ہم اسلم کی نئی کار میں بیٹھنے کے قابل نہ سمجھے گئے ہوں!"

"دوستی کے بے لوث جذبوں اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کے درمیان سوٹ اور بوٹ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی" ـــ رضا کا لہجہ گمبھیر تھا۔

"تو پھر دوستی کے بے لوث جذبوں اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کو پامال کرنے والے دوستی اور اخلاق کے مجرم ہو سکتے ہیں، ہمارے نہیں!" میں نے ذہنی کشمکش سے نکل کر سکون کی طرف لوٹنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کہنا کیا چاہتے ہو؟" رضا نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میرے اندر اور باہر کپکپی سی ہونے لگی۔ میں نے خود کو سنبھالا اور ڈرتے ڈرتے کہا،

"میرا مطلب ہے کہ ہمیں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا احساس کر کے دکھی نہ ہونا چاہیے"

پھر تو وہی ہوا جس کا ڈر تھا، میری بات نے بارود میں آگ لگا دی، رضا بھڑک اُٹھا۔ اس نے پلٹ کر میرے شانوں کو جھنجھوڑ دیا اور چیخ پڑا۔

"پھر تو ہمیں خودکشی کر لینی چاہیے، اس لیے کہ احساس ہماری ذات سے الگ کوئی چیز نہیں، احساس کے بغیر زندگی ایک بوجھ ہے، بے وقعت ہے، بے کار سی ایک شئے ہے!"

پھر اس کے ہاتھ میرے شانوں سے پھسل کر نیچے جھول گئے۔ وہ پہلے کی طرح خاموش ہو گیا، اس طرح جیسے طوفان ایک پل کے لیے آ کر گزر گیا ہو، میں نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی تو اس نے پھر مجھے دیکھا، لیکن اس بار مجھے خوف محسوس ہوا اس لیے کہ رضا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اس کی اپنی مسکراہٹ، دل کے نرم گوشوں کو چھو لینے والی، اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شاکر! بے حس ہو کر جینا بھی کوئی جینا ہے، ہمیں مر جانا گوارا ہونا چاہیے لیکن احساس کی موت کیا، اس کا مجروح ہونا بھی گوارا نہ ہونا چاہیے، اور کیا ہے ہمارے پاس سوائے احساس کے!"

ہمارے گرد پھر خاموشی چھا گئی، لیکن یہ خاموشی ہمیں ہمارے وجود کا پتہ دے رہی تھی۔!!

★

جینے کی راہ

..... جب وہ حد سے گزرنے لگتا تھا تو ڈاکٹر داس اس کا ہاتھ تھام لیتے تھے۔

"اب بس کرو۔ بلا نوشی اچھی چیز نہیں، یہ آگ۔ دل، جگر اور پھیپھڑوں کو جلا دیتی ہے، غم غلط کرنے کا یہ طریقہ غلط ہے، میرے نوجوان دوست!"

اور وہ نشے سے بوجھل پلکیں اٹھا کر نیم وا آنکھوں سے اس طرح مسکرا کر ڈاکٹر داس کو دیکھتا تھا کہ اس کے جام بکف ہاتھ پر ڈاکٹر داس کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہے

ایک رات!

اس سے کچھ فاصلہ پر بیٹھے ہوئے ڈاکٹر داس نے محسوس کیا کہ آج یہ کچھ زیادہ اداس اور مضمحل ہے۔ دن بہ دن زرد ہوتے ہوئے چہرے پر کرب کی پرچھائیاں کچھ زیادہ ہی گہری ہیں۔ بار بار سینے پر ہاتھ پھیرنا، ایک ہی سانس میں گلاس خالی کرنے کے بجائے خلاف معمول ایک ایک گھونٹ حلق سے اتارنا کچھ اچھی علامت نہیں!

ڈاکٹر داس اس کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ اسے کھانسی آئی۔ وہ کھانسنے لگا، ٹھہر ٹھہر کر، اور پھر کھانسیوں کے درمیانی وقفے ختم ہو گئے۔ وہ کھانسنے لگا، مسلسل، سینہ دبائے، چہرے پر کرب کی پرچھائیاں اور واضح ہو گئیں

ڈاکٹر داس اس کے قریب آئے۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا انشو؟"

اس نے کھانسی ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ڈاکٹر داس کو دیکھا عجیب انداز سے مسکرا کر، ڈاکٹر داس چونک گئے۔ اس کی مسکراہٹ رنگین تھی

اس کے اپنے خون میں رنگی ہوئی، ڈاکٹر داس کے کچھ کہتے، کچھ کرنے سے پہلے وہ تیزی سے واش بیسن کی طرف بڑھا اور دودھ کی طرح سفید واش بیسن سرخ ہو گیا۔ خون کی الٹی۔ سبھی نے۔ کلب میں موجود سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ نڈھال ہو کر ایک طرف جھکا تو ڈاکٹر داس نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

ہوش آیا تو اس نے خود کو ڈاکٹر داس کے کلینک میں پایا، اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔ کچھ بولنا چاہا تو ایک خوبصورت صندلی ہاتھ اس کی طرف بڑھا، ایک حنائی انگلی اس کے ہونٹوں سے آلگی اور مترنم آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"پلیز، بولیے مت!"

اس نے دیکھا، آواز کا چہرہ آواز سے زیادہ حسین ہے، اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

پتھڈین (Pethedine) کا اثر ہونے تک وہ مضطرب اور بے چین رہا، کھانسیوں کا درمیانی وقفہ کچھ طویل ہو گیا تھا، لیکن ہر کھانسی کے بعد وہ کف کے ساتھ خون تھوکتا رہا۔ نرس اس کے ہونٹ صاف کرتی رہی، سینہ سہلاتی رہی، اس کے تڑپتے اور کراہتے جسم کو سنبھالتی اور سہارا دیتی رہی۔۔۔۔ وہ بار بار نرس کے ہاتھوں کو جھٹکتا رہا، اس کی طرف سے منہ پھیرتا رہا۔ اور نرس اپنا فرض ادا کرتی رہی، پھر اسے نیند آگئی، وہ بے خبر سوتا رہا۔

آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ جنرل وارڈ کی کھلی کھڑکیوں سے دھوپ اندر رینگ آئی تھی، اس نے وارڈ کا جائزہ لیا، نرس مریضوں کا ٹمپریچر لے رہی تھی۔ لیکن یہ وہ نہ تھی جو ساری رات اس کے قریب رہی تھی، اس نے اطمینان محسوس کیا، آنکھیں بند کر لیں، سوچنے لگا۔ کچھ نہ کچھ تو مماثلت ضرور ہے، رما اور رات والی اس خوبصورت نرس میں!

ایکس رے کی رپورٹ تشویشناک تھی، لیکن اتنی نہیں کہ ڈاکٹر داس مایوس ہو جائے، وہ اپنے چہرے سے فکر و تشویش کی گرد جھاڑ کر اس کے قریب آئے

"انسٹو! یہ کلب نہیں جہاں تم من مانی کیا کرتے ہو، یہ میرا کلینک ہے یہاں آنے والے وہی کرتے ہیں جو میں کہتا ہوں، تمھیں بھی وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گا میری مرضی کے بغیر تم اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ سب کچھ کھا تو سکتے ہو مگر دوا دودھ اور پانی کے علاوہ کچھ پی نہیں سکتے۔ اور بولنا بھی بند!"

وہ اپنے خاص انداز سے مسکراتے ہوئے نحیف آواز میں بولا۔

"یہ سب اس لیے کہ میں مر نہ جاؤں!"

"او، شٹ اپ، یہاں مرنے کی نہیں جینے کی باتیں ہوتی ہیں۔ مائی ینگ فیلو!" ڈاکٹر داس نے اسے ڈانٹا، اس ڈانٹ میں محبت تھی، بے انتہا خلوص تھا۔

ڈاکٹر داس نے اس کا معائنہ کیا۔ نرس کو ضروری ہدایات دینے کے بعد اس سے کہا۔ "انسٹو! کوئی علیحدہ کمرہ خالی نہیں، اس لیے دو چار روز اور تمھیں یہاں رہنا ہوگا!"

ڈاکٹر داس کی ہدایت کے مطابق نرس ایک ایک پل اس کی خبر لیتی رہی احتیاط سے دوائیں پلاتی اور کھلاتی رہی، لیکن چالیس کے ہندسہ کو چھوتی ہوئی یہ موٹی اور بھدی نرس بھی اسے گراں گزر رہی تھی، اس نے کئی بار سوچا، اس کے ہاتھ سے میٹھی دوائیں بھی کڑوی لگتی ہوں گی، مریضوں کا مزاج سنبھلنے کے بجائے بگڑتا ہوگا۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور رات والی خوبصورت نرس کا خیال آتے ہی وہ ذہن جھٹک دیتا تھا۔

مختلف دواؤں کی ملی جلی ناخوشگوار مہک کے درمیان خوشبو کے ایک لطیف جھونکے کے ساتھ وہی مترنم آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہیلو، کیسے ہیں آپ؟"

اس نے قریب ہی کھڑی مسکراتی ہوئی نرس کو دیکھا، منہ پھیر کر پھر آنکھیں

بند کر لیں۔ اور جیسے دل کی آنکھیں روشن ہو گئیں، اسے محسوس ہونے لگا، رما کھڑی اس کے حال پر مسکرا رہی ہے، اس کے زخموں پر نمک چھڑک رہی ہے۔ رما کے تصور سے اس کے اندر دکھ کی کرچیں بکھر گئیں، کرب کی تیز لہر سینے میں اٹھی، اور پھر، کھانسی ـــ کھانسی اور خون۔ نرس کی باہوں کے حلقے میں وہ دیر تک قابو پانے اور سانسوں کا توازن درست کرنے کی سعی کرنے لگا، جب درد کی لہر تھمی، سانسوں کا توازن قائم ہوا تو اس نے خوبصورت اور جوان نرس کے جوان لمس کو یوں محسوس کیا جیسے اس کے اندر سانپ سرسراتے پھر رہے ہوں۔ اور دو زہریلے ناگ اس کے جسم سے بھی لپٹے ہوں، اس نے چاہا نرس کو پرے دھکیل دے۔ ڈانٹ کر کہے، چلی جاؤ یہاں سے، پھر میرے قریب مت آنا، مجھے تجھ سے نفرت ہے۔ لیکن ابھی ہوش باقی تھا۔ وہ یہ سب کچھ کیسے کہہ سکتا تھا، جب کہ وہ نرس تھی صرف نرس۔

وہ آنکھیں بند کیے لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ نرس اس کے قریب بیٹھی اس کی نبض دیکھتی رہی، اس کا چہرہ تکتی رہی۔ اور پھر اسٹیپٹوکرومم (Styptochrom) کے بعد پیتھڈین کے انجکشن نے اسے سلا دیا، گہری اور پُر سکون نیند ـــ

ـــ روز و شب گزرتے رہے، مختلف امراض کے مریضوں کے درمیان وہ کھانستا اور خون تھوکتا رہا، دھیمی دھیمی آنچ میں سلگتا رہا اور اپنے بستر پر پڑا محسوس کرتا رہا جب سرگم آواز اور دلکش خد و خال والی نوعمر نرس آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے بیمار چہروں پر صحت مندی کی چمک آگئی ہے، زندگی سے بیزار مریض جینے کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔ اس کی حنائی انگلیوں میں پھنسے ہوئے شیشے کے گلاس سے مریض تلخ سے تلخ دوا شربت کے لذیذ گھونٹ کی طرح پی لیتے ہیں، اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے چھلکتی ہوئی نرم اور شفیق آواز بھی کانوں میں شہد گھول دیتی ہے۔ ـــ ظالم ہے بھی تو خوبصورت،۔

وہ خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا، کھانسیوں کا درمیانی وقفہ کچھ طویل ہو گیا تھا

کف کے ساتھ خون آنا بھی بند ہو گیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کے اندر کوئی چھپا بیٹھا ہو اور بار بار اس کی توجہ اس کی طرف موڑ دیتا ہو۔ وہ مریضوں کی ضرورتیں پوری کر رہی تھی۔ انھیں دوائیں دے رہی تھی، مسکرا مسکرا کر ہر ایک کا مزاج پوچھ رہی تھی، ہر چہرہ کھلا ہوا تھا، ہر چہرے سے صحت کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، وہ خود سے بے خبر سوچنے لگا، زندگی سے مایوس مریضوں کے لیے یہ نرس ہے یا فرشتۂ رحمت۔

وہ گھبرا گیا، اپنے بہکنے کے خیال نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا، وارڈ کے مریضوں سے گزر کر اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"کچھ دیر کے لیے فرصت ہو گئی۔ کہیے کیسے ہیں آپ؟" وہ اسٹول کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

وہ آواز کا ترنم محسوس کرتے ہوئے بھی بپھر سا گیا، اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "ٹھیک ہی ہوں"

"ٹھیک ہی ہوں، کیا مطلب، کوئی تکلیف ہو تو کہیے؟" وہ اس کی طرف جھک گئی۔

وہ خوشبو کے ایک لطیف جھونکے کو محسوس کرتے ہوئے بھی مایوس کُن لہجے میں بولا "یہ تکلیف کیا کم ہے کہ زندہ ہوں!"

وہ سنجیدہ ہو گئی، ہونٹوں سے تبسم کی کرنیں معدوم ہو گئیں، چند لمحے اسے تکتے رہنے کے بعد شفقتانہ لہجے میں بولی، "لاکھ تکلیف سہی پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ زندہ وہی رہتے ہیں جو دکھوں اور تکلیفوں سے لڑنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، موت کی تمنا تو بزدل کیا کرتے ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ بزدل نہیں ہیں۔" پھر وہ اس طرح مسکرائی جیسے کلی چٹک کر پھول بن گئی ہو۔

اس کا جی چاہا ان پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں کو نوچ لے، اس کی مسکراہٹوں کو

زخمی کر دے، اور کے شگفتہ رخساروں پر اتنے تھپڑ لگائے کہ وہ نیلے ہو جائیں، اور دھکا کر کہے کہ تو آئی ہے مجھے زندگی کا فلسفہ سمجھانے، خوبصورت ناگن! تو تو اب تک جان لیتی رہی ہے مجھ جیسے لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتی رہی ہے، تو کیا جانے زندگی کیا ہوتی ہے۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا مجبور اور بے بس پڑا رہا۔

انجکشن دینے اور دوائیں کھلانے پلانے کے بعد وہ کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

"ایک نمبر روم کچھ ہی دیر پہلے خالی ہوا ہے۔ صاف کرنے کو کہہ آئی تھی، دیکھ آؤں صاف ستھرا ہو گیا ہو تو آپ کو وہاں لے چلوں!"

وہ اُسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا، قد قیامت، شاخِ گل کی طرح لچکتی ہوئی کمر، بیلٹ سے کسی ہوئی کمر کے نیچے گداز کولھوں کا نمایاں خم، ایپرن کے نیچے کوندے کی طرح لپکتی ہوئی پنڈلیاں، اور چلنے کا یہ انداز، جیسے تیر رہی ہو، زمین سے اوپر فضا میں۔ سب کچھ، ہر ادا ایسی ہی ہے جیسی رما .... وہ مضطرب ہو گیا۔

نرس کے ساتھ ڈاکٹر اس کے قریب آئے تو اس نے سکون کی سانس لی، جیسے رما کے کربناک تصور سے نجات کا بہانہ مل گیا ہو۔

"ہیلو مائی ینگ فیلو! کیا سوچ رہے ہو؟" ڈاکٹر دام لہک کر بولے،

"کچھ نہیں!" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"جھوٹ! میں جانتا ہوں، جب تم تنہا ہوتے ہو تو سوچتے ہو بہت زیادہ۔ اور اب مجھے تمہاری سوچ کا بھی علاج کرنا پڑے گا" وہ اپنے ساتھ کھڑی نرس سے مخاطب ہوئے "خون آنا بند ہو گیا ہے، سینہ میں تکلیف بھی نہیں ہے اسٹیبو کردم اور پیتھڈین بند کر دو، باقی دوائیں چلتی رہیں گی، اور دواؤں کے ساتھ تمہاری پوری توجہ بھی ہونی چاہیے" پھر وہ مریض سے بولے "اب تم یہاں نہیں رہو گے، ایک نمبر روم کشادہ اور آرام دہ ہے، وہاں تم آرام سے رہو گے۔"

اس نے دل میں سوچا، اچھا ہی ہے اس وارڈ سے الگ تھلگ ایک کنارے پڑا رہوں گا۔ یہاں ڈیوٹی دینے والی یہ خوبصورت نرس وہاں ہو گی اور نہ مجھے رما کی یاد آئے گی

اس نے ڈاکٹر داس کی بغل میں کھڑی نرس کو دیکھا تو اسے اپنے اندر ایک خلش سی محسوس ہوئی، کچھ کھونے کا احساس ہونے لگا، وہ گھبرا گیا، اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش میں وہ بول پڑا۔

"یہ بہت اچھا ہوگا ڈاکٹر! میں وہاں تنہا پڑا رہوں گا!"

تم سے کس نے کہہ دیا کہ تم وہاں تنہا رہو گے، تم نے سنا نہیں میں نے نیرا سے کیا کہا ہے؟ ... تمھارے ساتھ یہ بھی ہوگی، بلکہ یہ سمجھو! آج سے میں تمھیں اس کے چارج میں دیتا ہوں۔" ڈاکٹر داس نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا اور نیرا کو دیکھا جو مہر تسلیم خم کیے خاموش کھڑی تھی۔

اسے الجھن سی ہونے لگی، بچا ہاڈاکٹر سے کہہ دے نہیں ڈاکٹر ایسا مت کرو! یہ خوبصورت نرس مجھے چین نہ لینے دے گی، میرے قریب اس کی موجودگی مجھے اس بے دل کی یاد دلاتی رہے گی جسے بھول جانے کی کوشش میں میں بستر مرگ تک آپہونچا ہوں، لیکن اس کے ہونٹ تھرتھرا کے رہ گئے، وہ کچھ نہ کہہ سکا، جیسے بے حد مجبور، بے بس ہو۔

— لمحے مہرکتے رہے، وقت گزرتا رہا، روز و شب بدلتے رہے اس کی تمام تر بے اعتنائیوں، بے رخیوں، جھڑکیوں اور نفرتوں کے باوجود، فرض شناس نرس اپنے فرض کی ادائیگی میں منہمک رہی، ایک ایک پل اس کا خیال رکھتی رہی ساری ساری رات جاگ کر اس کی تیمارداری کرتی رہی، قصے، کہانیاں اور لطیفے سنا سنا کر اسے ہنسانے اور خوش رکھنے کی کوشش کرتی رہی ——— اور رفتہ رفتہ وہ محسوس کرتا رہا، جیسے دن بہ دن نرس کے خلاف نفرت میں کمی آتی جا رہی ہو، اس کی غیر موجودگی میں کچھ کھونے اور کچھ پانے کا احساس شدید ہو جاتا ہو، اس کے قریب ہونے کی صورت میں وہ اپنے گرد و ماحول میں کچھ کمی محسوس کرنے لگا ہو۔

تیسرے ایکس رے کے بعد اسے اٹھ کر بیٹھنے کی، کمرے ہی میں دو چار قدم چلنے اور آہستہ آہستہ کچھ دیر بولنے کی اجازت مل گئی تھی، آج وہ خود کو تندرست محسوس کر رہا تھا

ذہن پر بھی کوئی بوجھ نہ تھا کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر آتے ہوئے ہواؤں کے خنک جھونکے اور کمرے کے ماحول میں رچی بسی بھینی بھینی خوشبو اسے فرحت بخش معلوم ہو رہی تھی، اور تمام کی دلکشی اس کے اندر مدتوں سے سوئی جاگی پہچانی خواہشوں کو چھیڑ رہی تھی، وہ بار بار قریب بیٹھی سویٹر بنتی نرس کو دیکھنے لگتا تھا، اون اور تیلیوں کے درمیان اس کی حنائی انگلیاں مشینی انداز سے متحرک تھیں۔ اس وقت وہ نرس کے مخصوص لباس میں نہیں سفید ساری اور بلاؤز میں ملبوس تھی۔ وہ پہلی بار نرس کو غور سے دیکھنے پر خود کو مجبور پا رہا تھا۔ سیاہ گھنیرے بال، کاجل سے بھری بڑی بڑی آنکھیں، شفق رنگ دہکتے ہوئے رخسار، گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح باریک متبسم ہونٹ، کشادہ شانے، سڈول صندلی بازو، بھرپور شباب کی نشاندہی کرنے والے پرکشش ابھار۔ اس کے دلآویز پیکر میں کتنی کشش، کتنا حسن تھا، وہ سراپا بہار تھی ——
اسے محسوس ہونے لگا جیسے مدتوں سے راکھ تلے دبی چنگاریاں بھڑکنے لگی ہوں۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہوئیں تو سانسوں کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ اس نے سرد لمبی سانس لی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی اس کی نظروں کو اپنے اوپر محسوس کیا تو شانے سے ڈھلکے ہوئے آنچل کا خیال آیا۔ پلکیں بار حیا سے جھک گئیں تو چہرہ گلنار ہو گیا، وہ آنچل درست کر کے اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"کیا بات ہے؟"
"کچھ نہیں!"
"تو پھر یہ لمبی سانس؟"
"بس یونہی!"

وہ خاموش رہی تو اس نے کہا، "تمہارا نام بھی خوبصورت ہے، نیرا، سرور کا احساس ہوتا ہے"

وہ متحیر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی، خلاف معمول اس کے اندر نمایاں تبدیلی محسوس کر رہی تھی، تھوڑے توقف کے بعد مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولی، "اس کا یہ مطلب ہے آج آپ بہت اچھے ہیں!"

"کیسے؟"

"آپ کا اس طرح میرے بارے میں سوچنا آپ کے صحت مند ہونے کی دلیل ہے۔" اس کے ساتھ وہ بھی مسکرانے لگی،

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا،

"ایک بات پوچھوں؟"

"کیا؟" وہ ہاتھ روک کر اس کی طرف جھک گئی

"تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
وہ گھبرا گئی، اتنی کہ پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے، انگلیوں کی گرفت میں تیلیاں کانپنے لگیں۔ وہ خاموش رہی تو اس نے جواب کے لیے اصرار کیا۔
"آپ کے اس سوال کا جواب پھر کبھی دوں گی۔" وہ الجھی ہوئی سانسوں کے درمیان اتنا ہی کہہ سکی۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں تو محسوس ہوا ایک سیاہ نقطہ پھیلتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہا ہو، گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اسے دیکھا، وہ پھر سویٹر بن رہی تھی، لیکن اب انگلیوں کی رفتار سست تھی،

"یہ سویٹر کس کے لیے بُن رہی ہو؟" اس نے خود کو بہلانے کی کوشش کی۔
"آپ کے لیے!" اس کا لہجہ پُرسکون اور سنجیدہ تھا،

"میرے لیے" وہ چونک گیا،

"ہاں جب آپ صحت یاب ہو کر یہاں سے جانے لگیں گے تو آپ کو بطور تحفہ پیش کروں گی۔"

"یہاں سے صحت یاب ہو کر جانے والے ہر مریض کو تحفہ پیش کرتی ہو؟" وہ خود کو کچھ بے چین سا محسوس کرنے لگا تھا،

"ہاں! لمبی عمر اور صحت مند زندگی کے لیے نیک خواہشوں کا تحفہ۔"

"تو پھر میرے لیے یہ سویٹر کیوں؟"

وہ نظریں نیچی کیے ہوئے بولی۔ "آپ ایسا سوال کیوں کرتے ہیں جس کا جواب میں نہ دے سکوں۔" کانپتا ہوا لہجہ اس کے اندر کی گھبراہٹ کو ظاہر کر رہا تھا،

وہ خاموش رہا۔ لیکن جیسے اسے خاموشی گراں گزر رہی تھی۔ کچھ اوپر کھسک کر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔

"میں آج تک تمھارے ساتھ بے رحمانہ سلوک کرتا رہا ہوں، اور تم ہر پل، ہر لمحہ میرے کام آتی رہی ہو، میرے دکھوں اور غموں کا مداوا کرنے کی کوشش کرتی رہی ہو۔ مجھے موت کے اندھیروں سے زندگی کے اجالوں کی طرف لوٹا لے جانے کے جتن کرتی رہی ہو۔ حالانکہ اب اس زندگی میں میرے لیے کوئی کشش نہیں۔ سوچتا ہوں زندگی کی لذتوں سے دور یہ بے کیف و بے رنگ زندگی لے کر کروں گا بھی کیا؟"

"کیا رما بھی اسی طرح سوچتی ہوگی،؟" اس کا لہجہ اب بھی سنجیدہ تھا،

وہ بری طرح چونک گیا، حیران اور ششدر نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم رما کو جانتی ہو؟"

"ہاں، ڈاکٹر داس نے آپ کی کوئی بات مجھ سے پوشیدہ نہیں رکھی ہے، رما بیوقوف تھی، اس نے آپ کو پہچانا نہیں۔ آپ کی محبت کی قدر نہ کی، اس نے۔ وہ محبت کے مفہوم کو سمجھی ہوتی تو اپنے عہد و پیمان پر قائم رہتی، وفا شعار و وفا آشنا ہوتی تو آپ کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر کسی اور کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دے دیتی، محبت اور دلوں کے درمیان قائم رشتے کا یہ اصول نہیں کہ جسے چاہا جائے اسے چھوڑ کر کسی اور کا ہو جایا جائے!"

وہ بولتی رہی اور وہ حیران و ششدر نگاہوں سے اسے تکتا رہا، وہ خاموش ہوئی تو اس نے مایوس لہجے میں کہا،

"اسی بات کا تو دکھ ہے کہ رما نے دھوکا دیا، ایک کھلونا سمجھ کر کھیلتی رہی مجھ سے اور میں۔۔۔۔۔!"

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی

"دکھ کی بات یہ نہیں کہ رما کسی اور کے ساتھ چلی گئی۔ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ آپ

اس کے لیے خود کو تباہ کر رہے ہیں جسے آپ کی فکر نہیں، اگر کسی سنگین مجبوری نے اسے آپ سے الگ کر دیا ہوتا اور آپ ایسا کرتے تو ایک بات بھی تھی۔ آپ کو پُرسکون اور مطمئن ہونا چاہیے کہ وہ وقت سے پہلے بے نقاب ہو گئی، اگر شادی کے بعد اس نے ایسا کیا ہوتا تو . . . . . . ؟"

وہ کانپ گیا، جیسے ذہن کو شدید جھٹکا لگا ہو، وہ خاموش رہا، وہ بھی کچھ دیر خاموش رہی پھر کہنے لگی

"جسے آپ کی فکر نہ ہو اس کی فکر آپ کیوں کریں، سب کچھ بھول کر نئی زندگی شروع کیجیے، نئی زندگی اور نئی زندگی کی پُرمسرت اُمنگیں آپ کی منتظر ہیں۔" وہ سویٹر بننے لگی، وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہا، سوچتا رہا، ماضی کے بارے میں، ماضی اور حال کے درمیانی مختصر مدت کے بارے میں، اور مستقبل کے بارے میں، ——— اور جب خاموشی بھر گراں گزرنے لگی تو اس نے کہا۔

"نیرا تمھاری ہر بات درست، لیکن نئی زندگی شروع کرنا میرے لیے آسان نہیں، ہر طرف مایوسیاں اور محرومیاں ہوں گی، ہر طرف تنہائی کا سونا پن ہوگا، میرا زخمی وجود کیسے برداشت کر سکے گا یہ سب کچھ،"

اُس کے پنکھڑیوں جیسے ہونٹ متحرک ہوئے، ہونٹوں کے ساتھ آنکھیں بھی مسکرانے لگیں، بولی،

"کیسی مایوسی، کیسی تنہائی اور کیسا سونا پن، اپنی زندگی کا وہ دروازہ جسے آپ نے رآکی بے وفائی کی تاب نہ لا کر بند کر رکھا ہے، وا کر دیجیے تاکہ کوئی اچھی سی وفاشعار لڑکی ہمیشہ کے لیے آپ کی زندگی میں داخل ہو جائے اور پھر دیکھئے گا آپ کو زندگی سے کوئی گلہ ہوگا نہ شکایت، نہ تنہائی ہوگی نہ سُونا پن،"

اس کے ہونٹوں پر زہر خندہ سی مسکراہٹ پھیل گئی، زمانے بھر کی مایوسیاں اس کے اندر سمٹ آئیں۔

"اب کوئی لڑکی میری زندگی میں داخل ہونا پسند نہ کرے گی" اس کا لہجہ کرب ناک تھا،

"کیوں؟"

"سب کچھ جان کر بھی انجان بنتی ہو؟"

"نہیں میں ایسی کوئی بات نہیں جانتی، آپ بتایئے تو سہی"، وہ سراپا سوال بن گئی

"میرا یہ مرض ——— یہ جان لینے کے بعد کہ میں خون تھوکتا رہا ہوں، کوئی لڑکی میرے قریب آنا بھی پسند نہ کرے گی۔" اُس کی آواز درد و کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی، ہونٹوں پر تبسم کی کرنیں معدوم ہوگئیں تو آنکھوں کی چمک بھی ماند ہوگئی، شفق رنگ رخساروں پر سنجیدگی چھا گئی تو اس کی شخصیت اور پُروقار ہوگئی، نظریں نیچی کیئے ہوئے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"کیا میں آپ کے قریب نہیں ہوں؟"

وہ حیرت زدہ نگاہوں سے اسے تکنے لگا، اسے محسوس ہونے لگا، جیسے نیرا نے اس کی زندگی کے سخت مرحلوں کو یک لخت آسان کردیا ہو، اسے مایوسیوں کے اندھیرے سے نکال کر پُرمسرت اجالوں کی طرف لے آئی ہو۔ اس کی زندگی کی اُلجھی ہوئی ڈور کو سُلجھا کر اسے سیدھے راستے پر لے آئی ہو جس پر چلتے ہوئے قدموں کے ڈگمگانے کا اندیشہ تک نہ ہو، وہ نیرا کو تکتا رہا، اور نیرا کی حنائی انگلیاں اُون اور تیلیوں کے درمیان تیزی سے حرکت کرتی رہیں، وہ حنائی اُنگلیوں سے اُس کے لیے سوئیٹر بنتی رہی۔"

* * *

شام ہوگئی تو وہ بوجھل قدموں سے گھر کی طرف لوٹنے لگا۔ ویسا ہی جیسا صبح کو گھر سے نکلا تھا، ——— صبح سے شام تک وہ اَن گنت دروازے کھٹکھٹا چکا تھا اور اس ایک دن میں کئی بار اپنی سطح سے گرا، کئی بار اپنی غیرت کو اپنے ہاتھوں زخمی کیا، کئی بار اسے اپنے ضمیر کا گلا گھونٹنا پڑا، کئی بار اسے شرمسار ہو جانا پڑا، کئی بار اسے خود کو ننگا کر دینا پڑا، لیکن سب بے سود، بیکار۔ اپنی زندگی کے ان قیمتی سرمایوں کو صرف کر دینے کے باوجود وہ ویسا ہی رہا۔

وہ تو زندگی کے اس موڑ پر آ گیا تھا جہاں اس کے اپنے بھی اُسے دیکھ کر منہ پھیر لیا کرتے تھے، دوستی کا دم بھرنے والے دوست اُسے دور ہی سے دیکھ کر راستہ بدل لیا کرتے تھے، اور کوئی سامنے آ بھی گیا تو اس طرح کہ اگر جسم پر باریک قمیص ہے اور جیب سے نوٹ جھانک رہے ہیں تو اُن کے آگے رومال یا کوئی کاغذ رکھ لیا۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر اس کی نظر نوٹوں پر پڑ جائے گی تو وہ قرض انگ بیٹھے گا اور نہ دینے کی صورت میں دوستی پر آنچ آ جائے گی۔

وہ اپنی شاہکار تخلیقات بھی کئی رسالوں کے مدیروں کو سنا چکا تھا، لیکن اس کی یہ کوششیں بھی بے نتیجہ رہی تھیں،

ایک کثیر الاشاعت ماہنامے کے مدیر نے کہا۔

"میں اپنے رسالے کے ذریعہ تھکے ہوئے انسانی ذہن کے لیے تفریح کا سامان مُہیا

کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی یہ تخلیق بے شک شاہکار ہے، لیکن میرے رسالے کے مزاج اور معیار سے مختلف ہے، مجھے تو آپ کوئی تفریحی کہانی دیجیے، ایسی جس کی ہیروئن بہت خوبصورت ہو، کولھوں پر ساڑی باندھتی ہو، ہپّی اسٹائل سے۔ کھلے ہوئے بازوؤں والا چست اور مختصر بلاؤز پہنتی ہو، اور چلے تو اس طرح لچک لچک کر کہ کھلے ہوئے پیٹ اور نمایاں کولھوں کے درمیان پوشیدہ اسپرنگ کا گمان ہو۔"

ایک ترقی پسند رسالے کے اڈیٹر نے کہا۔

"آپ کی یہ تخلیق میں اور میرے ہی جیسے چند افراد پڑھ کر استفادہ حاصل کر سکتے ہیں لیکن مجھے تو اپنے مقصد کا خیال رکھنا پڑتا ہے، آپ کی کہانی کے کردار حقیقت کی نعاک گستاخی ضرور کرتے ہیں اور نقطۂ عروج بھی چونکا دینے کے لیے کافی ہے، لیکن سائنس کی اس بے پناہ ترقی کے زمانے میں عوام کا ذہن چونک جانے یا متحیر ہو جانے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے، میں تو اپنے رسالے کے لیے اس طرح کی نئی کہانیاں چاہتا ہوں جن کے کردار علم انسانی کردار سے الگ تھلگ ہوں، جیسے کسی کالی بلی کے پیکر میں کسی برگزیدہ شان کی روح حلول کر گئی ہو، کسی کتے نے کسی عظیم شخصیت کے مقدس جسم میں پناہ لے لی ہو۔ جن کے منہ سے نکلے ہوئے کلاموں کو سمجھنے کے لیے فلاسفی، بائیولوجی، اور ٹیکنالوجی وغیرہ کی دقیق کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑے اور کہانی اپنے کلائمکس کے ذریعہ ایسا تاثر چھوڑے کہ قارئین انتہائی ذہنی جدوجہد کے باوجود کچھ نہ سمجھ سکنے کی صورت میں خود اپنی ہی ذہنی کم مائیگی کا اعتراف کرلیں۔"

ایک خالص ادب پیش کرنے والے جریدہ کے وزیر اعظم نے کہا۔

"اردو ادب کے مستقبل کے موضوع پر آپ کا یہ مضمون یقیناً قیمتی اور اہم ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ میں اپنے رسالے میں لکھنے والوں کی مقررہ فہرست کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔"

اور وہ ان تمام مرحلوں سے گزر کر گھر لوٹ رہا تھا، خالی جیب!

گزشتہ رات اُس نے صرف دو روٹیاں کھائی تھیں جو کب کی تحلیل ہو چکی تھیں
اور صبح سے شام تک رسالوں کے دفتروں میں دو تین پیالی چائے ہی پی سکا تھا، حالانکہ
چائے کے ہر گھونٹ پر اُسے شدت سے صوفیہ اور بچوں کا خیال بے چین کرتا رہا، جو
بھوکے تھے اور بھوک کا واحد علاج تھی، روٹی، اور روٹی کے لیے ضرورت تھی پیسوں
کی اور یہی ایک چیز اس کے پاس نہ تھی۔ اور اس کے حصول کے لیے وہ سارا دن مارا
مارا پھرا اور کتنے ہی جاں گُسل لمحوں سے گزرا، ورنہ اور کسی چیز کی کمی نہ تھی، علم کا
خزانہ بھرا پڑا تھا، انسانی شعور کو بیدار کرنے والے ان گنت نسخے تھے اس کے پاس
سماج کی پُشت پر کلبلاتے ہوئے متعفن پھوڑے کو چیر کر فاسد مادّے کو نکال دینے
کے لیے اس کے ہاتھ میں قلم کا تیز نشتر تھا۔

حصولِ زر کے لیے وہ نہ جانے کتنے ہی دفتروں کے دروازے کھٹکھٹا چکا تھا،
اور ہر بار اُسے ناکامی اور مایوسی کا ہی سامنا کرنا پڑا تھا، ملازمت دینے والی بڑی بڑی
شخصیتیں اُس سے خوب واقف تھیں، اس کے رشحاتِ قلم سے مانوس تھیں، اس کی
ادبی صلاحیتوں کی معترف تھیں، لیکن ان کے ذہن میں اٹھنے والا یہ خیال کہ اپنی ہی دنیا
میں مگن رہنے والے، ورسی سی تخلیقات کی کھوج میں سرگرداں رہنے والے یہ ادیب
بھلا دوسروں کا کام کیا کریں گے۔ اس کی ملازمت کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہوتا
رہا، اس نے ٹیوشن کی تلاش میں بھی کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی، لیکن اپنی تمامتر علمی صلاحیتوں
کے باوجود وہ ٹیوشن حاصل کرنے میں محض اس لیے کامیاب نہ ہو سکا کہ ٹیوشن
دینے والے لوگوں کو اپنے بچوں کے اُس کی طرح ادیب ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا
وہ انتھک کوششوں کے باوجود شہر کی اچھی آبادی والے علاقے میں کوئی چھوٹا سا
مکان بھی کرایہ پر حاصل نہ کر سکا تھا۔ مکانوں کے مالکان کا خیال تھا، دال روٹی کی بھی
فکر نہ کرنے والا یہ ادیب ہر ماہ مکان کا پورا کرایہ بھلا کیا دے سکے گا، اور مجبوراً اُسے
شہر کے کنارے گندی بستی کے ایک بوسیدہ مکان میں پناہ لینی پڑی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا گھر کی طرف بڑھ رہا تھا، اس کا ذہن کسی نئی اور

انوکھی تخلیق کی کھوج کے بجائے بیوی اور بچوں کے خیال میں اُلجھا ہوا تھا، بچے بھوکے ہوں گے، دن میں چولھا نہ جلا ہوگا، بیوی بچوں کو دلاسہ دے دے کر میری راہ تک رہی ہوگی کہ کب پیسے کر آؤں اور چولھے میں آگ جلائے، لیکن یہ رات بھی یونہی گزر جائے گی، میرے بچے بھی فاقوں کی اذیت سے دوچار ہو رہے ہیں، اُف! کہاں سے لاؤں میں روٹی؟ —— لیکن روٹی کے علاوہ بھی تو اور بہت سی ضرورتیں پڑی ہیں میرے سارے کپڑے بچوں کے کام آگئے ہیں۔ صوفیہ کے بدن پر اب ایک ہی ساڑی رہ گئی ہے! اُس نے اپنے اوپر نظر ڈالی، میلا پائجامہ جس کے پائنچے جھڑنے لگے ہیں میلا کُرتا، کہیں کہیں سے مسکا ہوا اور زندگی کے کڑے سفر میں ساتھ دینے والا یہ چپل جو اب تھک گیا ہے۔

لاؤڈ اسپیکر کی تیز آواز نے اس کے خیالوں کے تسلسل کو توڑ دیا، وہ جنتر منتر کے قریب سے گذر رہا تھا، جنتر منتر کے میدان میں اُسے لوگوں کا ٹھٹھ نظر آیا، اونچے ڈائس پر کھڑا خوش وضع دیش بھگت لیڈر سنہرے فریم کا چشمہ لگائے، کھادی کے قیمتی کپڑے پہنے دیش کی تعمیر و ترقی کے موضوع پر تقریر کر رہا تھا، اُس نے ایک نظر مجمعے پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا، اُس کے بھوکے ذہن پر ایک سوال اُبھرا —— جس ملک میں تعمیر و ترقی کے علمبردار ہزاروں انجینئر بے روزگار ہوں، تعمیر و ترقی میں ہاتھ بٹانے والے انسانوں کو صحت و توانائی بخشنے والے لاتعداد ڈاکٹر بے کار ہوں، جس ملک میں انسانی شعور کو بیدار کرنے اور تعمیر و ترقی کا راستہ دکھانے والے ادیب اور فن کار بھوکے ہوں اس ملک کا مستقبل کیا ہوگا؟ اُس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایسی مسکراہٹ جو دل میں نشتر بن کر اُتر گئی، دل تڑپ اُٹھا، بھوکے ذہن میں ایسے کتنے ہی سوالات پوشیدہ ہیں، جن کا واحد جواب ہے روٹی،! جو بہت مہنگی شئے ہے، جو لاکھوں کروڑوں انسانوں کی دسترس سے باہر کی چیز ہو کر رہ گئی ہے۔

وہ روٹی کے امکان پر غور کر رہا تھا کہ سامنے حلوائی کی دوکان کے باہر پڑے ہوئے جُوٹھے پتوں کی طرف بھاگتا ہوا ایک مریل سا کتّا ایک تیز رفتار کار کے نیچے آ کر

بیچ سڑک پر ردی ٹوکری کی طرح پھیل گیا۔ ردی کے حصول کی خاطر ایک زندگی ضائع ہو گئی، وہ لرز گیا۔

لیکن صرف ردی ہی کیوں؟ اُس کے ذہن نے دوسری کروٹ لی۔

یہاں تو آدرشں اور اہنسا کی بات کرنے والے گوتموں کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کر دیا جاتا ہے، یہاں تو مادر وطن کی بیڑیاں کاٹنے والے اور آزادی کی زندگی عطا کرنے والے جری انسانوں کے سینوں میں ریوالور کی گولیاں اُتار دی جاتی ہیں، یہاں تو تہذیب وتمدن، زبان وادب کو خون سے سینچنے والے کتنے ہی ادیبوں کے پھول جیسے بچے فاقوں کی تمازت سے مُرجھا جاتے ہیں اور وہ خود دوا کے ایک ایک گھونٹ کے لیے تڑپ تڑپ کر خیراتی اسپتالوں میں مرجاتے ہیں، یہاں تو خونِ دل میں انگلی ڈبو کر ادب کی مانگ سجانے والے مجازوں کے جسموں پر پُراسرار نشانات پائے جاتے ہیں، اور ... اور نریش کمار شاد ... جس نے بھوکے ذہنوں کو علم کی خوراک مہیا کی، جو لوگوں کو تخریب کی پستی سے نکالنے کے لیے تعمیر کی بلندی کا راستہ بنانے میں ساری زندگی سرگرم رہا، جو اپنا سب کچھ سُرخ حاشیے، انڈیو، شانِ نزول، تاثیں، اور وجدان جیسی درجن آفریں اور لافانی تخلیقات کی صورت میں لوگوں پر نچھاور کر کے خود ذہنی پریشانیوں اور اُلجھنوں میں مُبتلا ہو گیا اور تنہا غموں کا بارگراں اُٹھائے زندگی کی سنگلاخ راہوں پر بھٹکنے لگا ـــ لیکن زمانے نے اُس کا بوجھ ہلکا نہ کیا، اُس کی پریشانیوں کا سدّباب نہ کیا اور تھک ہار کر اُسے جمنا کی آغوش میں پناہ لینی پڑی۔

اُس کے قدم گھر کی طرف بڑھ رہے تھے اور سوچ اور فکر کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا تھا۔

شادؔ تنہا اپنی موت کا ذمہ دار نہیں! اُس کی موت کے ذمہ دار ساتھ کروڑ عوام بھی ہیں، اگر سارے لوگ شاد کا غم تھوڑا تھوڑا بانٹ لیتے تو کسی کا کچھ نہ بگڑتا، اور وہ زندہ رہتا۔ سب کے لیے،

اچانک اُس کی آنکھوں کے سامنے بہار کے ایک ہفتہ وار پرچے کا وہ صفحہ گھوم

گیا جس میں شاد کی بیوہ اور بچے کی امداد و اعانت کے لیے چندے کی اپیل کی گئی تھی، وہ سوچنے لگا۔ جس بھرم کو قائم رکھنے کے لیے شاد زندگی کی ساری مصیبتیں جھیل گیا وہ سارا بھرم پاش پاش ہو کر رہ گیا تھا، ایک ادیب کی اس سے بڑی تذلیل اور کیا ہو سکتی ہے، زبان و ادب کے نام پر دولت جمع کرنے والے ادبی سیٹھوں اور ساہوکاروں کی تو کمی نہیں، کیا شاد کی بیوہ کی دہلیز پر چپکے سے اتنی رقم نہیں رکھ دی جا سکتی تھی جس سے اُس کی عمر بسر ہو جاتی اور بچے کا مستقبل سنور جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟؟؟

اب تو سوال ایک شاد کا نہیں!

اُس کی ذہنی رو بھٹک گئی۔ اگر میں بھی مر جاؤں تو؟

۔ ۔ ۔ ۔ تمام اخباروں میں میری موت کی خبر جلی حرفوں میں چھپے گی، سیکڑوں روپے خرچ کر کے تعزیتی جلسے ہوں گے، بیانوں، نظموں اور تعزیتی مضامین کے ذریعہ اپنے اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا جائے گا، میری موت کے طفیل کتنے ہی لوگ رسالوں میں چھپ جائیں گے، میری تخلیقات کے گُن گائے جائیں گے میری بیوی اور بچوں کی امداد کے لیے چندے کی اپیل کے بعد سَو، پچاس کی رقم منی آرڈر آنے لگے گی اور پھر رفتہ رفتہ منی آرڈروں کی آمد کم ہونے لگے گی۔ پندرہ، دس، پانچ، دو اور اب میری بیوی کو کئی کئی روز ہو جائیں گے ڈاکیہ کا انتظار کرتے لیکن وہ تو راستہ بھول جائے گا میرے گھر کا، یا پھر لوگ اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے ہوں گے (یا پھر کوئی حادثہ ہو جائے گا) میری موت کے غم میں روتے روتے میری وفا شعار بیوی کی آنکھیں جو میری کتنی ہی تخلیقات کی محرک ہیں بے نور ہو جائیں گی، بچوں کے روشن مستقبل کی فکر اُسے دیمک کی طرح چاٹنے لگے گی۔ میری موت کے دو چار برس کے بعد ہی میرے فن کو جمالیاتی شعور بخشنے والی میری بیوی ادھیڑ عمر سے بھی زیادہ معلوم ہونے لگے گی، مالک مکان کرایہ کی ادائیگی نہ ہونے پر گھر سے نکال دے گا، وہ سڑک پر ہوگی، اُس کی سیاہ حلقوں کے بیچ بے نور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوں۔ بال بکھرے ہوں گے، پھٹی پرانی ساڑی سے اُس کا جسم جھلکتا ہو گا۔

چھوٹے بچے کو گود میں لیے منجھلے بچے کی انگلی پکڑے ہوگی اور بڑا بچہ جو میرے بعد اپنی ماں اور چھوٹے بھائیوں کا واحد سہارا ہے میری ہی کوئی نظم میرے ہی ترنم میں گا رہا ہوگا ۔۔۔۔۔۔۔۔!!

اُس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا، کتنا کرب ناک تھا یہ تصور! کتنا بھیانک تھا موت کا یہ خیال، وہ مضطرب ہوگیا، نہیں نہیں! میں ابھی نہیں مروں گا!!! ایک ادیب کے حال و مستقبل کا خیال اِس مُلک کو ہو یا نہ ہو لیکن مجھے تو اپنی بیوی اور بچوں کی فکر کرنی ہی ہوگی۔

اور وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

آفتاب کب کا غروب ہو چکا تھا، برقی قمقموں کی روشنی سے مارکیٹ روڈ جگمگا رہی تھی، ہر طرف چہل پہل تھی،

دروازے میں قدم رکھتے ہی اُسے صوفیہ کی آواز سنائی دی

"ضد نہیں کرتے بیٹا، کھالو!"

"نہیں ماں، یہ سوکھی روٹی حلق سے نہیں اُترتی"، بڑا بچہ کہہ رہا تھا

"دیکھو تو یہ تمھارے چھوٹے بھائی کتنے مزے میں کھا رہے ہیں، تم بھی پانی میں بھگو لو۔۔۔۔"

"نہیں ماں! میں تو سالن لُوں گا۔"

"پھر وہی بات! کہا نا اس وقت پانی میں ڈال کر کھالو، تمھارے ابّو اتنا سارا پیسہ لانے گئے ہیں، کل سویرے اچھی اچھی چیزیں پکا کر کھلاؤں گی!۔۔"

"ہمارے یہاں بھی اچھی اچھی چیزیں پکیں گی ماں!" منجھلے بچے نے حیرت ظاہر کی۔۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں، بس اب تم لوگ جلدی جلدی کھا کر سو جاؤ، کل سویرے اُٹھنا ہے!"

اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، وہ سوچنے لگا، اِس وقت تو یہ بہل جائیں گے

لیکن آنے والی صبح کو ابھی پکوان کا انھیں جلد بیدار کر دے گا، اور سارے دن کی دوڑ دھوپ اور جستجو کے بعد بھی اس کی جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں! اور اچانک اُسے خیال آیا، لیکن اِس وقت بچوں کو روٹی کہاں سے مل گئی؟ جبکہ گزشتہ شب بہت مشکل سے صرف روٹی کا بندوبست کر سکا تھا۔ جس میں دو چار روٹیاں صوفیہ نے بچوں کے ناشتہ کے لیے بچالی تھیں۔ اور اُسے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ یقیناً صوفیہ نے رات روٹی نہیں کھائی تھی اور اپنے حصّے کی بھی روٹی بچا کر رکھ لی تھی، یہ سوچ کر کہ شاید دوسرے دن کوئی بندوبست نہ ہو سکے۔ تو کیا وہ رات سے بھوکی ہے؟ وہ کانپ گیا، کچھ دیر دروازے میں کھڑا سوچتا رہا اور پھر واپس سڑک پر آ گیا

تیز تیز قدم بڑھاتا وہ مارکیٹ روڈ سے گزر رہا تھا، مینا بازار کے صدر گیٹ کے سامنے رکشوں کی قطار لگی تھی،

بھائی جی ایک سواری!

اسٹیشن!

برٹی سینما!

چرچ روڈ!

رکشا والوں کی آوازیں بازار کے ہنگاموں میں سواریوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

"اسٹیشن کا کیا لو گے؟" ایک آدمی آگے بڑھا اور ان میں سے ایک سے بولا۔

"ایک روپیہ ریٹ ہے صاب! وہی دیدیجے گا!"

وہ ان رکشا والوں میں سے ایک کے قریب آیا ——!

—— صبح آفتاب طلوع ہونے سے پہلے وہ گھر لوٹا، پریشاں حال، پسینے میں شرابور، بوجھل بوجھل قدموں سے، جیسے تھک کر چور ہو گیا ہو۔

دروازے پر دستک دی، دروازہ کھلا، حیرت و یاس کی تصویر بنی صوفیہ سامنے کھڑی تھی، آنکھیں اُداس، ویران، جیسے ساری رات اُس کے انتظار اور بھوک کی

شدت سے سو نہ سکی ہو ۔ اُس نے آگے بڑھ کر بند مُٹھی صوفیہ کی ہتھیلی پر کھول دی ۔

ایک ایک روپیہ کے سات نوٹ اور کچھ ریزگاری اپنی ہتھیلی پر دیکھ کر صوفیہ کو حیرت ہوئی ، اور اُس کی طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو ——— یہ گیلے کپڑے ، یہ تھکا ہوا جسم ، یہ روپے ؟

اُس کے ہونٹوں پر مضمحل سی مُسکراہٹ اُبھر آئی ۔ اُس نے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے پیشانی پر رینگتے ہوئے پسینے کے قطروں کو ایک طرف سمیٹ لیا ۔ کتنے ہی قطرے پیشانی سے چھوٹ کر زمین پر آ گرے ، جیسے کسی شہنشاہ کے تاج میں جڑے ہوئے قیمتی موتی ٹوٹ کر بکھر گئے ہوں ۔

اُس نے صوفیہ کے بے ترتیب بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا ۔

” تمھارا قرب ہی تو میری زندگی کا سرمایہ ہے ، کیا ہوا جو مجھے ساری رات رکشا چلانا پڑا !!

اور صوفیہ کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے ڈھلک کر رخساروں پر آگرے جیسے واقعی اُس نے خودکشی کر لی ہو ۔ “

* * *

جنم جنم کا ساتھ

"یہ لڑکی پسند ہے؟"

"نہیں!"

جب بھی کوئی اچھی لڑکی نگاہ میں آئی تو اُسے یا اس کی تصویر دکھا کر بھائی جان سے پوچھا جاتا۔ "یہ لڑکی پسند ہے" — اور جواب میں نہیں سن کر ہم جھنجھلا جاتے کبھی کبھی تو یہ جھنجھلاہٹ خاموشی کے دبیز پردوں میں چھپائی جاتی اور کبھی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے بھائی جان کے انکار کے ساتھ ہی ہمارے قریب کوئی بم پھٹ گیا، زمین تہہ و بالا ہوگئی، تمناؤں کی لہلہاتی کھیتیاں مرجھا گئیں، ارمانوں کا شیش محل مسمار ہو گیا۔

امّی پورے عتاب کے ساتھ بھائی جان پر برس پڑتیں۔

"ارے تو کب تک چھڑا گھومے گا؟ اپنا نہیں تو ہمارا ہی خیال کر، ساری عمر ماں بہن کی ٹھوکی روٹیاں توڑتا رہے گا کیا؟ ایک سے ایک بڑھ کر لڑکیاں دکھا چکی ہوں۔ ایسی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا جائیں۔ مگر صاحبزادے کو ایک بھی پسند نہ آئی۔ ارے کہیں دیکھ رکھی ہے تو کہہ، کسی ایسی ویسی سے آنکھ لڑائی ہے تو وہ بھی بول۔ اسی مُردار کو گھر لے آؤں —!

اور بھائی جان تو جیسے چکنا گھڑا تھے، سب کچھ سُنتے اور مُسکراتے رہتے، میں چھوٹی بہن تھی اس لیے اپنے غصّہ کا اظہار ناشائستہ الفاظ میں نہیں کر سکتی تھی حالانکہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، بس اتنا ہی کہہ کر چُپ ہو جاتی۔ "اب آپ کے لیے جنّت سے

حد نہیں بھیجی جائے گی، لڑکیاں کسی کارخانے میں نہیں بنتیں جو آپ کی پسند اور خواہش کے مطابق آرڈر دے کر بنوالی جائے۔ رضیہ، شیریں، جبیں، اور فرزانہ جیسی لڑکیوں کو ناپسند کرنے والے کے متعلق تو یہی کہا جائے گا کہ اُس کا ذوق نظر ہی خام ہے اُسے خوبصورتی کی پہچان ہی نہیں۔"

بھائی جان میری جلی کٹی سُن کر ہنستے ہوئے کہتے،

"میں جانتا ہوں تجھے میری شادی کی فکر کیوں ہے؟ تو یہی چاہتی ہے ناکہ میری شادی جلدی سے ہو جائے تاکہ تیرا راستہ صاف ہو اور تیرے لیے بھی ایک اچھا سا گُڈا ڈھونڈ نکالا جائے، کیوں، ہے نا یہی بات؟"

اور میں شرما کر بھاگ جاتی۔ بھائی جان کی یہ بات درست بھی تھی۔ امی یہی چاہتی تھیں کہ پہلے دوسرے کی بیٹی بہو بن کر اس گھر میں آجائے تو وہ اپنی بیٹی کو گھر سے نکالیں ورنہ گھر سونا سونا سا ہو جائے گا، اُن کی دیکھ بھال اور ضرورت کا خیال کرنے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔ اور میرے چلے جانے سے سب سے زیادہ تکلیف خود بھائی جان کو ہو گی، وہ تو گھر کے اندر خود کچھ کرنے کے بجائے دن بھر حکم چلاتے رہتے ہیں۔"

"۔ثریا! جلدی سے ایک پیالی کاغذی لیموں کی چائے تو بھجوانا۔"

"اری او ثریا کی بچی، کب سے کہہ رہا ہوں امی سے بیس روپے مانگ لا مجھے بازار جانا ہے۔"

"اے ثریا! سن، کل بھی کہا تھا لیکن تو نے کیا نہیں۔ آج اگر لوٹ کر بستر کی چادر اور تکیہ کا غلاف بدلا ہوا نہ پایا تو یاد رکھ چانٹا مار دوں گا۔ سمجھی!"

"میری بہن! کتنی اچھی ہے تو، خدا ایسی بہن سب کو دے، آ ذرا ان کتابوں کو جھاڑ جھاڑ کر الماری میں تو سجا دے۔"

اب اگر ایسی صورت میں بھابی کے آنے سے پہلے میں گھر سے چلی گئی تو یہ ساری دھونسیں کون سہے گا؟ بھائی جان کے سارے کام کون کرے گا

بھائی جان کی اِس "نہیں" کے پس منظر میں ابّو اور امّی کو کچھ نظر آتا تھا یا نہیں۔ یہ تو میں نہیں جانتی تھی، البتہ میرے دل میں کبھی کبھی یہ خیال پیدا ہوتا، کہیں ایسا تو نہیں کہ بھائی جان شادی ہی نہ کریں۔ ہائے اللہ اگر ایسا ہوا تو؟

الطاف حسین ابّو کے پُرانے اور اچھے دوستوں میں سے تھے، جب وہ فیض آباد سے تبدیل ہو کر یہاں آئے تو ابّو نے اُن کی لڑکی نکہت کو دیکھا۔ نکہت انھیں بہت اچھی لگی، انھوں نے مجھے اور امّی کو ان کے یہاں بھیجا تاکہ ہم بھی نکہت کو دیکھ لیں، اگر وہ ہمیں پسند آجائے تو پھر بھائی جان کو دکھائی جائے۔ کیا پتہ نکہت ہی بھائی جان کو پسند آجائے۔

ہم ماں بیٹی کو نکہت بہت ہی اچھی لگی۔ ہزاروں میں ایک، صورت ایسی کہ جو دیکھے دیوانہ ہو جائے۔ نکہت کو دیکھتے ہی میرا تو جی چاہا بھابی کہہ کر لپٹ جاؤں اور چٹ چٹ اُس کے سُرخ سُرخ رخساروں کے کئی پیار لے ڈالوں، اگر میں لڑکا ہوتی تو ابّو اور امّی سے صاف صاف کہہ دیتی،

"بس یہی ہے وہ میرے خوابوں کی تعبیر، میرے سپنوں کی رانی۔"

لیکن ـــ خدا سمجھے بھائی جان سے جب انھیں نکہت خوب بنا سنوار کر دکھائی گئی تو انھوں نے ایک نظر نکہت کو غور سے دیکھا اور پھر اِس طرح آنکھیں پھیر کر کمرے سے نکل گئے، جیسے مردوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے والی کوئی کشش ہی نہ ہو نکہت میں۔ یا پھر اُن کے اندر ہی وہ جذبات نہ ہوں جو کسی جوان، خوبصورت اور اور پُر کشش لڑکی کو دیکھ کر مچل اٹھتے ہیں۔ امّی نے بھائی جان سے کہا "بیٹے شاہد! چراغ لے کر ڈھونڈو گے تب بھی نکہت جیسی بیوی نہ ملے گی، ماشاء اللہ، اتنی خوبصورت ہے کہ چہرے پہ نگاہ نہیں ٹکتی۔ اُسے دیکھ کر اپسرائیں بھی رشک کریں چندرے آفتاب، چندرے ماہتاب، اندھیرے گھر میں جائے گھر روشن ہو جائے، اب تو ہاں کہہ دو؟"

بھائی جان نے مسکراتے ہوئے کہا "امّی واقعی نکہت بہت خوبصورت ہے، لیکن

صرف ظاہری خوبصورتی سے کیا ہوتا ہے، اصل چیز تو سیرت ہے، اچھا مزاج ہے
گھر گرہستی کو سنبھال لینے کی صلاحیت ہے، اگر نکہت آپ لوگوں کو پسند ہے، تو ٹھیک ہے
کر دیجیے میری شادی اُس سے، میں انکار نہ کروں گا۔ لیکن شادی سے پہلے ایک ستو ڈرم
بھی بنوا دیجیے گا تاکہ اُسے میں ستو ڈرم میں سجا کر رکھ سکوں، اُسے گھر لانے سے پہلے دو
ماسیاں بھی بحال کر لیجیے، تاکہ وہ نکہت کے آگے پیچھے بھاگ دوڑ کرتی رہیں، ایک اچھا بینک
بیلنس بھی ہونا چاہیے تاکہ میں اس کی فرمائشیں پوری کرتا رہوں، اور وہ خوش رہے —
میں نے تو اُسے دیکھ کر یہ اندازہ لگایا ہے کہ وہ گھر کے کام کاج سے اپنے ہاتھ بھی میلے ہونا
پسند نہ کرے گی۔ میں تو کہتا ہوں اُسے دال بگھارنا بھی نہ آتا ہوگا۔ اور دھان پان ایسی
کہ ضرورت پڑنے پر پانی کا ایک گلاس بھی نہ اُٹھا سکے! امّی! کوئی ایسی لڑکی کیوں
نہیں دیکھتیں جو مجھ سے زیادہ آپ کا خیال رکھے، جسے آپ ہی کی طرح اس گھر کی
بھلائی اور بہتری کا خیال ہو۔ آپ کے بعد ثریا کو ماں کی کمی نہ محسوس ہونے دے اور
جو شوہر کو بوائے فرینڈ نہیں مجازی خدا تصور کرے، خواہ بدصورت ہی کیوں نہ ہو۔"

بھائی جان کی باتیں سُن کر ہم حیران بھی ہوئے اور خوش بھی، اُن کی نہیں،
کی اصل وجہ آج ہماری سمجھ میں آگئی تھی۔ امّی نے ان کی پیشانی چومتے ہوئے دعائیں
دیں۔ "جیو میرے لال، خدا تجھ سا بیٹا سب کو دے۔"

اور میں دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ بھائی جان کو کتنا خیال ہے ہمارا۔ کتنے اچھے
ہیں یہ، اِن جیسا تو کوئی نہ ہوگا۔

ایک دن ——

بھائی جان مردانے سے اُٹھ کر اندر آئے تو مجھے بہت زیادہ اُداس نظر آئے
میں نے اِس اُداسی کی وجہ پوچھی تو کچھ بتانے کے بجائے کہا۔ "ثریا! میں تین چار
دنوں کے لیے باہر جا رہا ہوں، تم میرا مختصر سامان تیار کر دو، ابھی اور اِسی وقت، میں
ابّو اور امّی سے مل کر آرہا ہوں۔"

اُن کے جانے کے بعد امّی نے مجھے بتایا کہ وہ مظفر پور گئے ہیں۔ اُن کا کوئی

دوست بیمار ہے۔

لیکن جب دس دنوں بعد بھائی جان واپس آئے تو ہم حیران و ششدر رہ گئے اس لیے کہ وہ تنہا نہیں تھے، اُن کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ میلی کچیلی، مریل سی ہڈیوں کا ڈھانچہ، جیسے برسوں سے اُسے روٹی کا ایک ٹکڑا میسر نہ ہوا ہو۔ اُلجھے ہوئے بال، سیاہ حلقوں کے بیچ بجھی بجھی سی آنکھیں، حزن و ملال کی زندہ تصویر!

ہمیں خیال آیا بھائی جان اُس لڑکی کی مفلسی اور بے چارگی پر ترس کھا کر اسے کسی فٹ پاتھ سے اُٹھا لائے ہیں، تاکہ اِس گھر میں کام کاج کر کے اپنا پیٹ پال سکے ——— بھائی جان ہیں بھی ایسے ہی آدمی، رحم دل، انسان دوست!

لیکن جب بھائی جان نے بتایا کہ وہ لڑکی اُن کی بیوی اور ہمارے گھر کی بہو ہے تو ہر طرف ایک بھیانک سناٹا چھا گیا، ہم حیران و پریشان ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے، میں نے محسوس کیا یہ بھیانک سناٹا ایک مہلک طوفان کا پیش خیمہ ہے اور وہ طوفان اب اُٹھنے ہی والا ہے، ایسا طوفان جو ابّو کا عتاب اور امّی کی پھٹکار بن کر بھائی جان اور اس مریل سی لڑکی پر ٹوٹ پڑے گا، جو بھائی جان کا ہاتھ تھام کر اس باعزت گھرانے میں داخل ہونے چلی آئی تھی۔ میں خاموش بیٹھی سہمی سہمی نظروں سے ابّو اور امّی کو دیکھ رہی تھی۔

جب ابّو اور امّی نے اپنی اپنی آنکھوں میں غیظ و غضب کے اُمڈتے ہوئے طوفان کو لیے ہوئے آخری بار ایک دوسرے کو دیکھا تو میں اور سہم گئی، لیکن عین اُس وقت جب ابّو اپنی جگہ پہلو بدل کر پھٹ پڑنے کے لیے خود کو تیار کر چکے تھے، بھائی جان نے کہا۔

”کچھ کہنے سے پہلے میری پوری بات سُن لیجئے تو اچھا ہے“

ہم اُن کی طرف دیکھنے لگے اور بھائی جان کہنے لگے،

”اگر میں پہلے ہی آپ لوگوں کو بتا دیتا کہ میں مغربی دیناج پور جا رہا ہوں، وہاں پناہ گزیں کیمپ میں میرا دوست فیاض زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے تو آپ لوگ

یہ سوچ کر مجھے جانے نہ دیتے کہ کیا پتہ وہاں جاکر میں کس مصیبت سے دوچار ہو جاؤں
مجھے افسوس ہے کہ مجھے آپ لوگوں سے جھوٹ بولنا پڑا کہ میں مظفرپور جارہا ہوں، لیکن
میں اس جھوٹ کے لیے شرمندہ نہیں ہوں اگر میں جھوٹ نہ بولتا تو فیاض کی روح،
ہمیشہ بے چین رہتی، وہ سکون سے مر بھی نہ سکتا۔

"کون فیاض ؟" ابو نے دریافت کیا۔

"میرا دوست، چٹاگانگ میں انجینئر تھا!"

"کیا ہوا اُسے ؟"

"وہی جو ہر زندگی کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات یہ حقیقت کچھ اس
طرح سامنے آتی ہے کہ مرنے والے کی یاد ایک درد بن کر تاعمر دل پر کچوکے لگاتی رہتی
ہے —— جس دن میں یہاں سے گیا ہوں، اُسی دن مجھے فیاض کا خط ملا تھا، لکھا
تھا۔"

"میں دیناج پور پناہ گزیں کیمپ میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہوں تم جلد
آکر مجھ سے ملو!"

جب میں دیناج پور پہونچا تو دیکھا لاکھوں بے گھر اور لوٹے ہوئے لوگوں
میں فیاض بھی ہے، اور سخت بیمار بھی ہے، پھر فیاض نے مجھے بتایا۔

"........ جب پاکستان میں انسانوں کے ہاتھوں سے انسانیت
کا دامن چھوٹ گیا اور ظلم اور بربریت کا ننگا ناچ شروع ہو گیا تو ہم اپنے مختصر خاندان
کے ساتھ ہندوستان کی سرحد کی طرف چل پڑے، گھر، کاروبار، ملازمت عیش و آرام
سب کچھ چھوڑ کر —— ابھی ہم ہندوستان کی سرحد سے بہت پیچھے تھے کہ دائفل
کی ایک گولی نے والد کے سینے میں پناہ لے لی ہمارے سروں سے شفقتوں کا سایہ
اُٹھ گیا۔ اور جب ہم والد کے بغیر ہندوستان آئے تو پناہ گزیں کیمپوں میں پھیل
جانے والی وبائی بیماری نے والدہ کو بھی ہم سے چھین لیا۔ میں اِس صدمۂ جانکاہ سے
خود کو سنبھال بھی نہ سکا تھا کہ کئی دنوں سے میرے جلتے ہوئے جسم کو دیکھ کر ڈاکٹر نے

بتایا کہ مجھے ٹائیفائڈ ہوگیا ہے ـــــ اور اب میں مر رہا ہوں، کیوں مر رہا ہوں اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں! میں سب کچھ لُٹ جانے، خود کو موت کے آہنی پنجوں میں جکڑا ہوا دیکھنے کے باوجود صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ میرے بعد میری یاسمین کا کیا ہوگا؟ وہ نفرت سے بھری اس دنیا میں کس کس کی آنکھ میں اپنے لیے پیار ڈھونڈتی پھرے گی۔؟ کہاں پناہ ملے گی اِسے، کون سا دروازہ ہوگا اس کے لیے، جہاں یہ عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکے گی؟ کون رکھے گا اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ؟ کون سنبھالے گا اس مجبور اور بے سہارا لڑکی کو؟ . . . . . کون؟ ـــ کون؟ ـــ کون ـــ؟ . .

اور ـــ اور ابو، میں ضبط نہ کر سکا، میرے اندر کا انسان جسے، آپ ہی کے خون نے پالا ہے، چیخ پڑا، "میں . . . . . . میں سنبھالوں گا اِسے، میں سہارا بنوں گا تمھاری بہن یاسمین کا" ـــ اور میں نے یاسمین کا ہاتھ تھام لیا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!

بھائی جان اور بھابی جان کے پیچھے ملزم کی طرح سہمی اور سر جھکائے کھڑی یاسمین کے ساتھ ہم سب کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اور ان آنسوؤں نے کچھ دیر پہلے پھوٹ پڑنے والے آتش فشاں کو بھی سرد کر دیا۔ ابو نے گلوگیر آواز میں کہا، ۔

"تم نے بہت اچھا کیا بیٹا! بہت اچھا کیا، کاش تم جیسے میرے ہزاروں لاکھوں بیٹے ہوتے۔!"

امی بھی اپنے جذبات کو نہ روک سکیں۔ انھوں نے لپک کر یاسمین کو سینے سے لگا لیا۔ اور ممتا کا بحرِ بیکراں اُبل پڑا، اور میں سوچنے لگی۔ کتنے عظیم اور بلند ہیں، میرے بھائی جان، ہمالیہ کی طرح۔ اس ہمالیہ نے نہ صرف روایات و انسانیت کی بلکہ اِس ملک کی عظمت کی بھی لاج رکھ لی ہے، اور ـــ اور میرے بھائی جان نے دو ملکوں کے بیچ ٹوٹتے ہوئے رشتے کے بندھن کو تھام لیا ہے۔ اب کبھی نہ ٹوٹے گا یہ بندھن، کبھی نہیں ـــ کبھی نہیں!!۔

★ ★ ★

ٹوٹا ہوا آدمی

...... رات نصف کے قریب پہونچنے والی ہے ۔ درجۂ حرارت اس قدر گر گیا ہے کہ باہر کی ہلکی ہوا خنک تر ہو گئی ہے اور یہ خنک ہوا میرے اندر کی آگ کو اور ہوا دے رہی ہے ، آگ کی لپیٹیں ذہن کے دور دراز گوشوں تک کو چھو رہی ہیں ۔ میں مضطرب ہوں لیکن مجھے سب کچھ یاد آرہا ہے ، میرے قریب بیٹھی شاہدہ مجھے غور سے تک رہی ہے اسے انتظار ہے میرے بولنے کا ، میرے کچھ کہنے کا لیکن میں خاموش ہوں — رفیق کو گئے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے ہیں لیکن میں اپنے جلتے ہوئے ، سلگتے ہوئے ذہن میں اس کے قدموں کی دھمک اب بھی محسوس کر رہا ہوں ، بظاہر میں خاموش ہوں ، لیکن میرا سلگتا ہوا ذہن خاموش نہیں ہے ۔ سب کچھ یاد آرہا ہے — سب کچھ — اور میں پیچھے کی طرف لوٹ رہا ہوں ....

میرے گرد آدمیوں کی بھیڑ ہے آگے پیچھے ، دائیں بائیں ، نزدیک اور دور ، لیکن جب میری نظر اس پر پڑتی ہے تو میں سوچنے لگتا ہوں ، آدمیوں کی اس بھیڑ میں یہ آدمی اتنا مختلف کیوں ہے ؟ میں اس سے اپنا تجزیہ کرنے لگتا ہوں تو تجزیہ کے لمحات طویل نہیں ہونے پاتے ہیں ، کمتری کا احساس میرا سر جھکا دیتا ہے ، میں محسوس کرنے لگا ہوں آفتاب سے ذرّے کا مقابلہ کرنے چلا ہوں ، میں اکثر سوچنے لگتا ہوں ، کیوں نہ میں بھی اسی جیسا بن جاؤں ، لیکن عین اسی وقت جب میں اس جیسا بننے پر خود کو آمادہ کرنے لگتا ہوں مجھے اپنے قریب کسی وجود کا احساس ہوتا ہے اور اس سے قبل کہ نظر اٹھا کر سامنے

دیکھوں میرے سامنے ایک ہاتھ بڑھتا ہے، ہاتھ بڑھنے کے عمل کے ساتھ ہی ایک آواز میرے کانوں میں اتر جاتی ہے۔

"کتنے مسائل، کتنی مجبوریاں؟"

میں اس بڑھے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں میں دس یا بیس کے نوٹ دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی ساری ضرورتیں صف باندھے کھڑی نظر آتی ہیں، مشاہدہ کی دوائیں، بچوں کے کپڑے، مکان کرایہ، بجلی کا بل، بنئے کا قرض اور ــــ اور تب مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے پھیلتے پھیلتے سمٹ کر پھر ایک سیاہ نقطے میں تبدیل ہو جانے کا، روح کے کرب اور ضمیر کی پژمردگی کا، اور میں اپنے اندر قہقہوں کی گونج محسوس کرنے لگتا ہوں، اور ان قہقہوں کے بیچ اُبھرتی ہوئی ایک ہی آواز "ناممکن ــــ ناممکن" ــــ مجھے بے چین کر دیتی ہے میں اپنی بند مٹھی پینٹ کی پچھلی جیب تک لے جاتے ہوئے اپنے اندر کے قہقہوں اور دایک ہی آواز، پر اپنی آواز کا بوسیدہ خول چڑھانے لگتا ہوں۔

"ہو جائے گا۔ ہو جائے گا!" اور میں سوچ نہیں پاتا ہوں کہ کیا ہو جائے گا؟ سامنے کھڑے ہوئے آدمی کا کام جو میرے بس میں ہے، یا میرے اُس جیسا بننے کا عمل جو میرے ــــ! اور جب احساس کے نیزوں کی یلغار تھمتی ہے اور میرے اندر کا میں گزرتے ہوئے لمحوں کے ساتھ سکون کی طرف لوٹتا ہے تو مجھے رفیق سے رشک ہونے لگتا ہے، میں ہی نہیں سبھی رشک کرتے ہیں رفیق سے، اپنے بھی، بیگانے بھی دوست بھی اور جو دشمن نہیں ہیں وہ بھی، اس لیے کہ رفیق عام آدمیوں سے الگ ہے سبھوں سے جدا۔ منفرد شخصیت، ــــ!

بہیترا سیوں سے افسران تک یہ جانتے ہیں کہ رفیق رشوت نہیں لیتا، اپنے کام کے سلسلے میں ضابطہ، اُصول اور فرض کا خیال رکھتا ہے، مزاج کے اعتبار سے نرم اور اصول کے اعتبار سے سخت ہے، اصول کا سخت ہونے کے باوجود کسی کو خود سے برہم یا بدظن ہونے کا موقع نہیں دیتا۔ اوپر سے نیچے تک، اندر سے باہر تک، سبھوں کو خوش رکھتا ہے۔ وہ کسی کے سامنے اتنا نہیں جھکتا کہ ٹوٹ جائے، کسی سے اتنا نہیں ڈرتا کہ ڈرپوک سمجھا جائے

کسی کی اتنی تعریف نہیں کرتا کہ اُس پر خوشامدی ہونے کا لیبل چپکا دیا جائے —

شاید وہ آج کا آدمی نہیں ہے —

جب ہم چند دوست ایک جگہ ہوتے ہیں اور گفتگو کے دوران رفیق کا ذکر آجاتا ہے تو وہ ہمارے درمیان بحث کا موضوع بن جاتا ہے۔

"رفیق رشوت نہیں لیتا پھر بھی اُس کی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں، لیکن کیسے؟"

اور اس کیسے کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا، سب خاموش ہو جاتے ہیں جیسے کوئی معرکہ سر کرنے میں ناکام رہے ہوں۔ — لیکن میں کچھ نہ جانتے ہوئے کچھ کچھ جانتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ فرق اپنے آپ کو برتنے اور استعمال کرنے کا ہے، ہم زبان کھول دیتے ہیں وہ منہ بند رکھتا ہے ہم اپنے چہروں پر کرب کی پرچھائیاں سمیٹے رہتے ہیں اور وہ اپنے چہرے پر خوشیوں کی قندیلیں روشن کیے رہتا ہے، ہماری آنکھوں میں اُداسیوں کے اندھیرے ہوتے ہیں اور اُس کی آنکھوں میں زندگی کے اُجالے، ہم زندگی سے بیزاری کا بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور وہ زندگی سے سمجھوتے کا، ہم حالات کی چوٹ سے تلملا جاتے ہیں اور وہ ہر چوٹ کو ہنس کر سہہ لیتا ہے۔ ہم غم روزگار کا رونا روتے پھرتے ہیں اور وہ غم روزگار کا استقبال کرتا ہے مسکراہٹوں اور قہقہوں سے۔ ہم زندگی کو بوجھ سمجھتے ہیں اور وہ زندگی کو بوجھ کی طرح ڈھونے کا قائل نہیں، ہنس کر گزارنے کا قائل ہے، وہ کہتا ہے، آدمی ہر حال میں آسودگی کی عادت ڈال لے تو لفظ ناآسودگی بے معنی، مہمل اور بے وقعت ہو کر رہ جائے۔ اُس کا قول ہے آدمی رو رو کر خود کو کھوتا ہے اور ہنسنے سے خود میں محفوظ رہتا ہے، لیکن — سب حوصلے اور جرأت کی بات ہے، اور میں اپنے آپ پر، اپنے گرد آدمیوں کی بھیڑ پر نظر ڈالتا ہوں تو کہیں نظر نہیں آتا، ایسا حوصلہ، نہ ایسی جرأت، تب مجھے پانچ فٹ سات انچ اونچا رفیق ہمالیہ سے بھی زیادہ اونچا نظر آنے لگتا ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے جب ہم چند دوست آفس سے نکل کر آفس کیا ڈنڈے بے نام ہوٹل یا چائے خانے میں آ بیٹھتے ہیں تو باتوں کے دوران دل ہی دل میں سوچتے ہیں دیکھیں

چائے کا آرڈر کون دیتا ہے ۔ مطلب یہ کہ جو آرڈر دے وہ پیسے بھی دے اور جیب کوئی پہل کرتا نظر نہیں آتا تو کسی نہ کسی زبان سے یہ بات چھلک پڑتی ہے چائے کا آرڈر کون دے گا بھائی ؟ تو ہم بغلیں جھانکنے لگتے ہیں ، اس لیے بھی کہ اگر کسی نے چائے کے ساتھ کچھ نمکین یا میٹھے کی بھی فرمائش کر دی تو ...... ؟ ایسے میں رفیق ہمارے درمیان ہوتا ہے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے ۔ وہ خود پوچھتا ہے ، صرف چائے یا کچھ اور ؟ اور اس سے پہلے کہ ہم کچھ کے جواب میں کچھ کہیں وہ آرڈر دے دیتا ہے ، ڈوڈ سموسے اور چائے اور میں شدت سے محسوس کرنے لگتا ہوں ۔ ناجائز کمائی کرنے والوں پر ایمان دار آدمی کی یہ نوازش ایک تازیانہ سے کم نہیں !

ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوستوں میں سے کسی کو روپیوں کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور وہ رفیق سے اپنی ضرورت کا اظہار کرتا ہے تو اُسے مایوس نہیں ہونا پڑتا ۔ اگر رفیق بروقت ضرورت پوری کرنے کے قابل نہیں ہوتا تو کچھ دیر انتظار کرنے کو کہتا ہے اور میں سمجھ جاتا ہوں اب یہ ناظر سے پیشگی دے دے گا اور ناظر اپنی ذمہ داری پر اسے روپے دے دے گا اس لیے کہ ناظر جانتا ہے کہ رشوت نہ لینے والا رفیق رشوت لینے والوں کے مقابلے میں کھرا ہے ۔ تنخواہ کے دن ایک ایک پیسہ ادا کر دے گا ۔

آفس ہی نہیں ، آفس سے باہر بھی وہ ایسا ہی ہے ، رفیق ۔ سب کا رفیق ! ۔

ایک شام ، آفس سے گھر لوٹتے ہوئے میں نے اُس سے کہا ۔ " سبھی کی ضرورتیں پوری کر دیتے ہو ، پر تمہاری ضرورتیں ؟ "

اُس نے فوراً جواب دیا " میں خود کو ضرورتوں کے جال میں نہیں اُلجھاتا ! "

" تمہاری گھریلو ضرورتیں بھی کم نہ ہوں گی اور تم دوسروں پر اپنی آمدنی کا ایک معقول حصّہ خرچ کر دیتے ہو ! "

اُس نے تھوڑے توقف سے کہا ۔ " میں نے تھوڑے میں گزر کرنا سیکھ لیا ہے کام چل جاتا ہے ! "

میں نے ٹھٹک کر پوچھا " خوب ! تھوڑے میں گزر کر لیتے ہو ، کام چلا لیتے ہو ، تو

پھر یہ کام مشکل ہی سے چلتا ہوگا۔ اپنی اہم ضرورتوں کا گلا گھونٹنا پڑتا ہوگا تمھیں!"
وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے دباتے ہوئے بولا۔ "اگر تمھیں دوسروں کی ضرورت اپنی ضرورت سے اہم معلوم ہو تو تم کیا کروگے؟"
میں خود کو اس سوال کے سامنے بے بس محسوس کرنے لگا، خاموش رہا تو اس نے کہا،

"میں دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت سے اہم سمجھتا ہوں اس لیے اپنی ضرورت کا گلا گھونٹ دیتا ہوں، اور گلا گھونٹنے کی تکلیف پر دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کی خوشی کا مرہم لگا لیتا ہوں تو سکون مل جاتا ہے، تم بھی ایسا کر کے دیکھو نا؟"
"باز آیا میں اس طرح سکون حاصل کرنے سے!" میں نے جھنجھلا کر یہ تو کہہ دیا لیکن محسوس کیا جیسے میں پانا چاہ رہا ہوں وہ کھو رہا ہوں۔ کھونے کے اس احساس نے مجھے بے چین کر دیا تو میں اپنے اندر سے باہر نکل بھاگنے کی کوشش کرنے لگا

"تم تنہا نہیں ہو، بیوی ہے، بچے ہیں، چھوٹے چھوٹے بھائی بہن ہیں، ماں ہے۔ ذمہ داریوں کا کوہ گراں ہے تم پر، ضرورتوں کا ایک گھنا جنگل ہے تمھارے سامنے، اور آمدنی — محدود صرف ایک ملازمت، اور پھر حال کے سامنے لق و دق، بے آب و گیاہ مستقبل۔ تمھیں چاہیے کہ ....!" میں نے قصداً اپنی بات ادھوری چھوڑ دی
"کیا چاہیے مجھے؟" اس نے دریافت کیا۔
ڈرتے ڈرتے میں نے کہا، "تمھارے پاس اچھا عہدہ ہے، سو پچاس روز کما سکتے ہو ایسا ہی ہے تو مانگو مت لیکن جو دے اُسے لینے میں کیا اعتراض ہے!"
مجھے ڈر تھا کہ وہ بگڑ جائے گا، لیکن میرے گرد اس کی ہنسی بکھر گئی۔ ہنستے ہنستے بولا،
"محنت کے بغیر جو بھی ملے میں اُسے کمائی نہیں کچھ اور سمجھتا ہوں!"
رفیق نے "کچھ" کی وضاحت نہیں کی، لیکن میں تلملا گیا جیسے اُس نے مجھ پر بھرپور وار کیا ہو — اور پھر وہ سنجیدہ ہو گیا میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے بولا۔
"میں جس سطح پر ہوں اُس سطح پر قائم رہنا چاہتا ہوں، رشوت لے — رشوت دینے والوں

کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتا اور نہ اپنا بھرم گنوانا چاہتا ہوں، چند روپیوں کے لیے خود پر جبر کیوں کروں، خود کو اخلاقی، سماجی اور قانونی مجرم ہونے کے خوف میں مبتلا کیوں کروں، خود کو اپنی نظروں میں شرمسار اور پشیمان کیوں ہونے دوں، میرے حالات خواہ کیسے بھی ہوں میں مطمئن ہوں، بہت مطمئن!"

میرے پاس اب کہنے کو کچھ نہ تھا۔ خاموش رہا تو اس نے کہا،

"اب تک میں نے خود کو سنبھال کر رکھا ہے، اپنے حالات پر قابو پائے ہوئے ہوں لیکن جس دن حالات مجھ پر قابو پالیں گے اور وقت مجھے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کردے گا، اس دن میں ٹوٹ جاؤں گا، ٹوٹ کر بکھر جاؤں گا!" وہ خاموش ہو گیا میں بھی خاموش تھا، لیکن سوچ رہا تھا، رفیق کے حالات مجھ سے اور مجھ جیسے بہتوں سے مختلف نہیں ہیں، لیکن ہم حالات کے سامنے مجبور اور بے بس ہیں، ضرورتوں کے حصار میں قید ہیں۔ اور صبر، ضبط اور قناعت کا پیکر یہ شخص حالات کی ستم ظریفی کے سامنے سینہ سپر اور ضرورتوں کی قید سے آزاد ہے۔

—— رات نصف کے قریب پہونچنے والی ہے ...... اب سے تین گھنٹے قبل ...... میں اپنے بستر پر نیم دراز پہلو میں بیٹھی شاہدہ کو چھیڑ رہا تھا، وہ میری چھیڑ چھاڑ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے میرے اور قریب آتی جا رہی تھی کہ باہری دروازے پر دستک ہوئی، میں نے شاہدہ کو دیکھا شاہدہ نے مجھے، جیسے ہم ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں، اس وقت کون؟ میں دروازے سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تو شاہدہ دوسرے کمرے میں چلی گئی، میں نے دروازہ کھولا تو چونک گیا، اس لیے نہیں کہ میرے سامنے رفیق کھڑا تھا، بلکہ میرے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ میرے سامنے جو رفیق کھڑا تھا یہ وہ رفیق نہیں تھا جسے میں روز دیکھتا تھا، ہنستا ہوا، مسکراتا ہوا، زندہ دل۔ اس وقت جو رفیق میرے سامنے کھڑا تھا، مُرجھایا ہوا تھا، اُداس اور غم زدہ تھا، ملول و مضمحل تھا، میں سہم گیا۔ اس کا ہاتھ تھام لیا، کمرے میں لایا، اپنے قریب بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"خیریت تو ہے؟" — اس وقت وہ کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا کہ اس سے زیادہ کچھ کہنے یا پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی مجھ کو۔

کچھ دیر تو وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا پھر رُک رُک کر بولا۔ "امتیاز! آج حالات نے مجھے بے بس کر دیا ہے، وقت نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں ..... !" وہ اس طرح خاموش ہو گیا جیسے اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو اس میں، زمانے بھر کا درد سمٹ آیا ہو اس میں —

"کیا بات ہے، کچھ کہو!؟" میں نے اس کی پُشت پر ہاتھ رکھا تو وہ اپنے اندر بے چینی سی محسوس کرنے لگا، رفیق مجھ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا لیکن میں اس کی پلکوں کو نمناک ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ کسمساتے ہوئے اور اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جلدی سے بولا —

"کچھ روپے ہیں تمھارے پاس ؟"

مجھے محسوس ہوا جیسے اس ایک جملے کو ادا کرنے کیلئے اُسے کتنے ہی کربناک مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ اپنی اب تک کی زندگی کا لہو نچوڑنا پڑا ہے۔

میں بُری طرح چونک گیا، پہلی بار رفیق اپنی کسی ضرورت کے سامنے بے بس ہو رہا تھا میرے جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی، دل زور زور سے دھڑکنے لگا، تیز دوڑتی ٹیبل فین کی خنک ہوا کے باوجود میں پسینے میں تر ہونے لگا۔ اس لیے کہ اس وقت میرے پاس صرف آٹھ دس روپے تھے، میں سوچنے لگا، اگر انکار کرتا ہوں، اپنی مجبوری ظاہر کرتا ہوں تو یہ اور افسردہ اور ملول ہو جائے گا اور انکار نہ کروں تو —— صرف آٹھ دس روپے —— پتہ نہیں اتنے روپیوں سے اس کا کام چلے گا یا —— میں اپنی ابتر ہوتی ہوئی کیفیت کو سنبھال نہ پایا تھا کہ رفیق نے سر جھکائے ہوئے ہی کہا۔

"وہ بینہ تین دنوں سے دردِ زہ میں مبتلا ہے اور تین ہی دنوں سے گھر میں ...!؟"

اس کی آواز ہونٹوں پر لرز کر دم توڑ گئی اُس کا سر اور جھک گیا۔

رفیق نے اپنی بات پوری نہ کی تھی لیکن میرے ذہن نے اس کی بات پوری کر دی

میں کانپ گیا۔ تین دن سے یہ زندگی کا سب سے بڑا، ناقابلِ برداشت دکھ جھیل رہا ہے، پھر بھی آج شام تک وہ نظر نہیں آیا تھا جو اس وقت نظر آ رہا ہے۔

میں کچھ کہنے کے لیے خود کو آمادہ کر رہا تھا کہ اُس نے کہا۔ "درد کی شدت سے تڑپتی ہوئی زرینہ کو ـــ نرسنگ ہوم میں داخل تو کر دیا ہے لیکن علاج اور دواؤں کے لیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"

میں اپنے پیروں تلے زمین کانپتی اور جسم میں چنگاریاں سی چھوٹتی محسوس کرنے لگا ــــ مجبوری، ندامت، اور شرمندگی کے شدید احساس نے مجھے اور بے چین کر دیا، اس وقت میرے پاس جتنے روپے تھے وہ رفیق کے کام نہیں آ سکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ میری زبان سے کوئی مایوس کن بات نکلتی دوسرے کمرے کے دروازے پر جانی پہچانی دستک ہوئی، میں سمجھ گیا شاہدہ سب کچھ سُن رہی ہے، دیکھ رہی ہے۔ میں دوسرے کمرے میں گیا تو شاہدہ نے کہا۔ "انکار مت کیجیے گا!"

میں نے دھڑکتے دل سے کہا "پر میرے پاس تو صرف آٹھ دس روپے ہیں جبکہ اس وقت رفیق کو کم سے کم ڈیڑھ دو سو روپیوں کی ضرورت ہوگی"

شاہدہ نے جلدی سے کہا۔ "میرے پاس ہیں، تھوڑا تھوڑا بچا کر دو سو روپے جمع کیے ہیں!"

میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جی چاہا شاہدہ کو سینے سے لگا لوں، بازوؤں میں سمیٹ لوں ــــ میں سمجھ رہا تھا اس وقت رفیق ٹوٹ ٹوٹ کر، ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہا ہوگا میں نے اس کی جیب میں دو سو روپے رکھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور محبت سے دباتے ہوئے کہا، "تم بہت زیادہ سوچتے ہو، سوچ سوچ کر خود کو ہلکان نہ کرو۔ یوں سمجھو یہ میرے نہیں تمھارے روپے ہیں اور میں بھی تمھارا ہوں، دوست، بھائی!"

مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میرے اندر محبت، ایثار و قربانی جیسے وہ تمام سوتے جو نہ جانے کب سے خشک پڑے تھے اُن میں اچانک انسانیت کے نیک جذبوں کا سیلاب اُمڈ آیا ہے، "رقیہ کی وہ بات "میں دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت سے اہم سمجھتا ہوں"

اس لیے اپنی ضرورت کا گلا گھونٹ دیتا ہوں اور گلا گھونٹنے کی تکلیف کو دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کی خوشی کا مرہم لگا لیتا ہوں تو سکون مل جاتا ہے ۔" آج میری سمجھ میں آ گئی تھی

رفیق نے تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا لیکن فوراً ہی اُس کی نظریں جھک گئیں ! کچھ تو پلکوں پر ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کے بوجھ سے اور کچھ اپنے ٹوٹنے اور بکھرنے کے احساس سے ۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن نہ کہہ سکا ، ہونٹ اس طرح تھرتھرا کر رہ گئے جیسے لفظوں کا شیرازہ بھی بکھر گیا ہو ۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا ، جلدی سے مڑا اور تیز تیز قدم بڑھاتا کمرے سے باہر نکل گیا ۔

—— رفیق کو گئے ہوئے بہت دیر ہو چکی ہے ، رات نصف کے قریب پہونچ چکی ہے لیکن میں لیٹے جلتے اور سلگتے ذہن میں اُس کے قدموں کی دھمک اب بھی محسوس کر رہا ہوں سب کچھ یاد آ رہا ہے ۔ اس کی وہ بات بھی —— "جس دن حالات مجھ پر قابو پالیں گے اور وقت مجھے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دے گا ، اُس دن میں ٹوٹ جاؤں گا ٹوٹ کر بکھر جاؤں گا !"

میرے قریب بیٹھی شاہدہ مجھے غور سے تک رہی ہے ، اسے انتظار ہے میرے بولنے کا ، میرے کچھ کہنے کا لیکن میں کچھ بولنا نہیں چاہتا کہ آج پہلی بار میں نے کسی آدمی کو ٹوٹتے اور بکھرتے دیکھا ۔

+ + +

پھول اور خوشبو

صبح کے دس بج چکے تھے۔

آفس جانے کا وقت ہو چکا تھا، لیکن میں اطمینان سے میٹھا چائے کے ہلکے ہلکے گھونٹ لے رہا تھا، میں جانتا تھا کہ اس اطمینان سے میرے معمول میں فرق آ جائے گا اور میں جو ہمیشہ وقت پر آفس پہونچتا ہوں آج لیٹ ہو جاؤں گا لیکن معمول میں فرق آ جانے کے احساس کے باوجود میں انتہائی سکون اور خوشی محسوس کر رہا تھا، اس سکون اور خوشی کی واحد وجہ قہقہوں کی وہ آوازیں تھیں جو اوپر کے کمرے سے آ رہی تھیں، میرا جی چاہ رہا تھا میں بھی ان قہقہوں میں شامل ہو جاؤں، لیکن ایسا کرنا میرے لیے مناسب نہ تھا حالانکہ ان قہقہوں میں میرے قہقہے بھی شامل تھے جو سنے نہیں محسوس کیے جا سکتے تھے۔

میں گزرتے ہوئے وقت کا خیال کیے بغیر اپنی جگہ خاموش بیٹھا چائے کے گھونٹ کے ساتھ اُن قہقہوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کتنی زندگی، کتنی اُمنگ اور کتنی بے فکری ہے اِن قہقہوں میں ——— اور اُن قہقہوں کے بارے میں سوچتے سوچتے میں نمرتا کے بارے میں سوچنے لگا۔

——— نمرتا میرے آفس میں کرد بھونڈنس کا فائل ڈیل کرتی تھی، عمر بیس اور بائیس کے درمیان ہوگی۔ چھریرا بدن، متناسب قد، نکھری ہوئی رنگت، بڑی بڑی کجرائی آنکھیں جاذبِ نظر خد و خال اور ہر وقت مسکراتے ہوئے پتلے پتلے ہونٹ، اور وں کے مقابلے میں خود اُس کے لیے کچھ زیادہ قاتل ثابت ہوئے تھے۔

میرے اور امرناتھ کے علاوہ آفس کا ہر فرد اپنی عمر اور پوزیشن کا خیال کیے بغیر ممتا کا شیدائی اور تمنائی تھا۔ ہر فرد اپنے طور پر سمجھ رہا تھا کہ ممتا اُس پر مہربان ہے، اُس پر بھی جان سے قربان ہے، ایسا سمجھنے اور سمجھانے میں ممتا کی مسکراہٹوں کو زیادہ دخل تھا۔ وہ بلا امتیاز اپنی مُسکراہٹوں کے پھول ہر ایک پر نچھاور کیا کرتی تھی۔ وہ ہر ایک سے اس طرح لہک لہک کر اور ہنس ہنس کر باتیں کرتی، سب کے ساتھ اِس فراخ دلی سے پیش آتی جیسے سب کی دلجوئی بھی اُس کے فرائض میں شامل ہو!

امرناتھ جو اب ریٹائر ہونے کے قریب آگئے تھے، اُنھیں ممتا ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ایک دن وہ میرے چیمبر میں آئے تو کہنے لگے۔

"صاحب، اچھا ہوتا کہ آپ ممتا کو ملازمت سے ہٹا دیتے!"

"کیوں؟" میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ تو سب سے الگ رہتے ہیں نا اس لیے آپ کو کچھ پتہ نہیں ہے، ممتا اچھی لڑکی نہیں ہے، اگر کچھ دن اور رہی تو آفس کے بابوؤں کا کریکٹر خراب ہو جائے گا۔ کیا پتہ، ـــــ وہ کچھ ایسی ہی لڑکی ہے۔ ابھی ابھی سریندر تیواری سے کہہ رہا تھا "ممتا کی باتوں میں مٹھاس ہے" تیواری نے کہا، "ابھی اُس کے ہونٹ بھی تو رسیلے ہیں" بھٹ جو ان کی باتیں سن رہا تھا، کہنے لگا، "میں تو اس کی ہر ادا کا دیوانہ ہوں۔" آپ ہی سوچیے صاحب! کیا ان باتوں سے پتہ نہیں چلتا کہ ممتا کا چال چلن اچھا نہیں!"

میں نے کہا۔ "امرناتھ جی! اس میں ممتا کا کیا قصور، قصور تو سریندر، تیواری اور بھٹ کا ہے جو اس کے بارے میں ایسی باتیں سوچتے ہیں اور پھر کسی لڑکی کے التفات کے فرضی فسانے گھڑ کر دوستوں میں اپنی برتری جتانا تو آج کل نوجوانوں میں ایک فیشن ہو گیا ہے۔ جہاں تک کام کا سوال ہے ممتا نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا، میں تو سمجھتا ہوں وہ ہنس مکھ لڑکی ہے، سب کے ساتھ اخلاق اور محبت سے پیش آتی ہے، ہو سکتا ہے اُس کے اس رویے سے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہوں!"

"لیکن جناب اچھے اخلاق کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا ہے سب سے ہنس ہنس لہک لہک

باتیں کی جاتی ہیں۔ کیا کوئی اچھی لڑکی ایسا کر سکتی ہے؟ میں تو کہتا ہوں نمرتا اچھی لڑکی نہیں ہے اسے نکال ہی دیجیے، ورنہ ایک دن آفس کی بھی بدنامی ہو جائے گی!''

بات کو اور طول نہ دیتے ہوئے میں نے کہا۔

''اگر یہ سچ ہے کہ نمرتا اچھی لڑکی نہیں ہے تو میں اُسے ضرور نکال دوں گا، لیکن ایسا کرنے سے پہلے میں اپنا اطمینان کر لینا بہتر سمجھتا ہوں!''

اور پھر بات آئی گئی ہو گئی۔

ایک شام۔

مہاراجہ لائبریری جاتے ہوئے شام کے ناشتے کے لیے میں اور دتیم میں داخل ہوا تو میری نظر نمرتا پر پڑی۔ وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ غالباً اس نے مجھے اور دشیم میں داخل ہوتے ہی دیکھ لیا تھا۔ میں آگے بڑھا تو وہ کھڑی ہو گئی۔ مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس نے مجھے پرنام کیا اور اپنے سامنے کی کرسی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی

''بیٹھیے نا سر''

اور جب میں بیٹھ گیا تو بولی

''سر آپ کہیں تو آپ کے لیے آرڈر میں ہی دیدوں''

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں کے ساتھ اُس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں میں نے کہا۔

''میں تمہاری اس خواہش کو درج کر دوں گا، لیکن پیمنٹ میں کروں گا۔ اپنا بھی اور تمہارا بھی!''

''نہیں سر! پیمنٹ بھی مجھے ہی کرنے دیجیے گا، پلیز!''

اس وقت وہ مجھے ایسی ہی معلوم ہوئی جیسے کوئی معصوم بچی کسی خوبصورت گڑیا کے لیے مچل جائے۔ مجھے اُس کی اس معصومیت پر ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔

''میں تمھارا باس ہوں، تمھیں بھی میری بات ماننی چاہیے، آؤ ذرا تم دو بیٹھ

یں کروں، بس دو دنوں کی بات رہ گئی ۔"

اور وہ مسکرا کر ایک ویٹر کی طرف مخاطب ہو گئی ۔

"آپ یہاں روز آتے ہیں سر ؟"

"نہیں ، میں ہوٹلوں میں کھانا پینا پسند نہیں کرتا ۔ لیکن جب مجبوری ہوتی ہے تو آ جاتا ہوں !"

"مجبوری ! میں سمجھی نہیں سر ؟"

"ان دنوں وہ نہیں ہیں ، عظیم آباد گئی ہیں ، اپنے میکے ۔ مجھے نوکروں کے ہاتھ کا کھانا اچھا نہیں لگتا اس لیے کبھی کبھار کسی ہوٹل میں کھا لیتا ہوں !" میں نے کافی کا آخری گھونٹ لے کر پیالی رکھتے ہوئے کہا ۔

"سر! کہیے تو میں آکر آپ کا کھانا پکا دیا کروں ؟ سب کچھ پکانا جانتی ہوں میں ۔"

اس نے میری طرف کنکھیوں سے دیکھتے اور مسکراتے ہوئے کہا ۔

نمرتا کی اس بات سے مجھے امرناتھ کی باتوں کی تصدیق ہوتی تو معلوم ہوئی ۔ میں نے سوچا اوم ناتھ ٹھیک ہی کہتے ہیں ۔ نمرتا مجھ پر بھی ڈورے ڈالنا چاہتی ہے ، ورنہ کسی لڑکی کو کیا پڑی ہے بڑھ کسی مرد کے خالی گھر میں جا کر اس کے لیے کھانا پکانے کو کہے خواہ وہ مرد اس لڑکی کا باس ہی کیوں نہ ہو ! ۔ میں نے کہا ۔

"نہیں نمرتا ۔ بہت مجھے بھی بدنام کر دیں گے !"

وہ اچانک بہت زیادہ اداس ہو گئی جیسے میرے اس جملے کے معنی کا مفہوم سمجھ گئی ہو ۔ میں اس کی اداسی کا خیال کیے بغیر جانے کے لیے اُٹھ گیا ۔

—— نمرتا کو رکھا جائے یا نکال دیا جائے ؟ اس بارے میں میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ ایک صبح جب کہ میں آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا ۔ میرے ملازم نے بتایا کہ ایک لڑکی مجھ سے ملنا چاہتی ہے ۔ میں نے ملازم سے کہا کہ وہ اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھائے ، میں ابھی آتا ہوں —— تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آیا تو دیکھا نمرتا صوفہ پر ایک کنارے بیٹھی ہے مجھے حیرت ہوئی ، نمرتا یہاں کیا کرنے آئی ہے؟

اس وقت تو اسے آفس میں ہونا چاہئے۔ سوچا ہو سکتا ہے، آفس ہی کے کام سے آئی ہو۔ لیکن فوراً ہی مجھے اپنے اس خیال کی تردید کردینی پڑی کیوں کہ جس اہتمام کے ساتھ وہ آفس جایا کرتی تھی، ایسی کوئی بات اس وقت اس میں نہ تھی۔ سر کے بال بے ترتیب تھے، چہرے سے اداسی اور ویرانی ٹپک رہی تھی، بڑی بڑی آنکھوں کے سرخ ڈورے بتا رہے تھے کہ وہ رات بھر سوئی بھی نہ ہوگی، اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ ہر وقت مسکراتے ہوئے ہونٹ اس طرح مرجھائے ہوئے تھے جیسے ان ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ آئی ہی نہ ہو! ساڑی بھی معمولی اور شکن آلود تھی۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"نرما اس وقت تم یہاں؟ اس وقت تو تمھیں آفس میں ہونا چاہئے؟"

"اب میں آفس نہ جاؤں گی سر! یہ میرا استعفا ہے!" اس نے نظریں نیچی کیے ہوئے ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے محسوس کیا اس کی آواز لرز رہی ہے

"کیوں!" میں نے لفافہ لیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"اب میں کام نہ کروں گی!"

"لیکن کیوں؟ کوئی اس سے بھی اچھی جگہ مل گئی ہے کیا؟" میری نگاہیں سوالیہ نشان بن کر اس کے چہرے پر جم گئیں، میری نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کر کے اس نے سر جھکا لیا اور بولی۔

"نہیں اب میں نوکری نہیں کروں گی، کبھی نہیں!"

میں نے اندھیرے میں تیر مارا۔ "او وہ سمجھا! شادی ہو رہی ہے تمھاری اور وہ لوگ نہیں چاہتے کہ تم ......" میری بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے دنیا کی ساری ویرانیاں اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی ہوں۔ میں سہم گیا، وہ کہنے لگی۔

"شادی! میں تو شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ شادی تو اس کی ہوتی ہے جس کی شادی کی فکر کرنے والا کوئی ہو۔ رشتہ ڈھونڈنے اور جہیز دینے والا ہو بڑی رقم اور جہیز کے بغیر کون کرے گا مجھ سے شادی؟ یوں کہنے کو تو ہمدرد سیکڑوں میں

لیکن میں سب سمجھتی ہوں لوگ مجھے چراغِ خانہ نہیں شمعِ محفل بنانا چاہتے ہیں، میری زندگی سے کھیلنا چاہتے ہیں، لیکن میں انہیں اپنی زندگی سے نہ کھیلنے دوں گی۔ کبھی نہ کھیلنے دوں گی!" اس کی آواز بھر آگئی ہونٹ کانپنے لگے۔

نمرتا کی باتوں نے مجھے نروس کر دیا، تھوڑی دیر تک خاموش اسے دیکھتا رہا پھر کہا۔

"مجھے افسوس ہے نمرتا! واقعی تمہارے حالات سنگین ہیں۔ لیکن تم مجھے وہ بات بتاؤ جس نے تمہیں نوکری چھوڑنے پر مجبور کیا!"

"کیا بتاؤں سر! کل جو کچھ بھی ہوا اسے زبان پر لانے سے پہلے جی چاہتا ہے یہ شہر ہی نہیں یہ دنیا بھی چھوڑ دوں، خودکشی کر لوں۔ اور ـــــ اب میں خودکشی کر ہی لوں گی سر! ایسے جینے سے تو مرنا اچھا ہے!" وہ دونوں ہتھیلیوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں اور حیران ہو گیا آخر کل کیا ہوا نمرتا کے ساتھ؛ میں نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے صوفہ پر بٹھا کر خود بھی بیٹھ گیا اور اپنے لہجے میں ہمدردی کے سارے جذبوں کو سمیٹتے ہوئے بولا۔

"تمہیں کیا دکھ ہے؟ مجھے بتاؤ، شاید میں تمہارے ـــ آ سکوں۔"

"دکھ ـــ دکھ صرف یہی ہے سر کہ میں ایک کمزور ۔۔ بے سہارا لڑکی ہوں۔"

میں پھر خاموش ہو گیا، نمرتا کی اب تک کی باتیں میرے لئے غیر متوقع تھیں، پھر بھی میں نے کہا۔

"سو تو ٹھیک ہے نمرتا، ہر نوکری کرنے والے کے ساتھ کچھ نہ کچھ مجبوریاں اور ذمہ داریاں ضرور ہوتی ہیں۔ اس وقت تو تم مجھے وہ بات بتاؤ جس نے تمہیں نوکری چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے؟"

"کوئی اور ہوتا تو میں کبھی نہ بتاتی، لیکن آپ ۔۔۔ آپ کو سب کچھ بتا دوں گی" اور وہ آنسوؤں کو آنچل سے صاف کرتی ہوئی کہنے لگی۔

"کل شام آفس سے سب کے جانے کے بعد جب آپ بھی جانے لگے تو آپ نے دیکھا کہ میں چند ارجنٹ خطوط ٹائپ کر رہی تھی۔ آپ کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد آپ کے اسسٹنٹ صاحب آئے، مجھے دیکھا اور اپنے چیمبر میں چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد چیمبر سے باہر آئے اور مجھ سے کہا کہ آئرن اینڈ اسٹیل کارپوریشن کے خطوط کا فائل لے کر اندر آجاؤ۔ میں فائل لے کر اندر گئی تو انھوں نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں بیٹھ گئی۔ وہ کچھ دیر فائل میں لگے خطوط اُلٹ پلٹ کرتے رہے، پھر اپنی جگہ سے اُٹھے، چیمبر کے دروازے تک آئے اور دروازہ بند کر دیا۔ میں ڈر گئی۔ اُس وقت مجھے اُن کی آنکھوں میں شیطان ناچتا دکھائی دیا۔ میں دروازے کی طرف بڑھی تو انھوں نے مجھے پکڑ لیا اور اس بات پر مجبور کرنے لگے کہ میں خاموشی سے اُن کی بات مان لوں اور خود کو اُن کے سپرد کر دوں۔ اور جب انھیں باز رکھنے کی میری ساری کوششیں ناکام ہوگئیں تو مجھے بھی مجبوراً سختی سے کام لینا پڑا۔ مجھے افسوس ہے سر کہ اپنی عزت بچانے کے لیے میں نے انھیں اس طرح دھکا دیا کہ وہ کرسی سمیت فرش پر گر پڑے۔ انھیں کافی چوٹ بھی آئی ہوگی۔ لیکن اُن کی چوٹ کا خیال کیے بغیر وہاں سے بھاگ گئی۔ مجبور تھی کیا کرتی!" وہ پھر رونے لگی۔

میں حیران و ششدر اُسے دیکھتا رہا۔

"اس سے پہلے بھی میں دو جگہوں سے اسی لیے ملازمت چھوڑ چکی ہوں سر"

اُس نے روتے ہوئے کہا۔

میں نے نمرتا کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"نہ رو نمرتا! میں یہ تو جانتا تھا کہ وہ اچھے چال چلن کا نہیں، لیکن یہ نہ جانتا تھا کہ وہ آفس میں کام کرنے والی لڑکی پر بھی بُری نظر ڈالے گا۔ خیر میں دیکھ لوں گا اُسے!" غصّے سے میری مٹھیاں بھینچ گئیں۔ میں نے نمرتا کے شانے کو پیار سے تھپکتے ہوئے کہا۔

"شام کو تم پھر مجھ سے ملو۔ جلد بازی میں کوئی قدم اٹھانا اچھی بات نہیں، اس

وقت گھر جاؤ ۔ میں سب ٹھیک کر دوں گا ! ،،

،، میرا گھر یہاں نہیں ہے ، مظفر پور میں میری ماں میرے دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہتی ہے ۔ میں یہاں ایک سہیلی سرتیا کے یہاں رہتی ہوں ۔ لیکن اب میں وہاں بھی نہ رہوں گی ، سرتیا کا بھائی بھی مجھے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا ، اکثر راتوں کو میں اُسے اپنے کمرے کے سامنے ٹہلتے دیکھ کر سہم جاتی ہوں ۔۔۔ میں یہ خوب جانتی ہوں کہ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں ، اگرچہ میں ہمیشہ یہی چاہتی رہی کہ باہمی اخلاق ، اپنی کھوکھلی ہنسی اور بے جان مسکراہٹوں کا سہارا لے کر اپنے اندر کے غم کو بھول جانے کی کوشش کرتی رہو ! دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہو کر خوش ہونے کی کوشش کرنا جرم تو نہیں سر ؟ ،،

میں نے کہا ،، نمرتا ! سچ تو یہ ہے کہ میں بھی تمھیں غلط سمجھنے لگا تھا ، لیکن آج معلوم ہوا کہ تم وہ نہیں جو لوگ سمجھتے ہیں ! ،،

وہ سسکیوں کے درمیان کہنے لگی ۔

،، جب سے بچپن کی حد سے نکلی ہوں لوگ مجھے مجبور اور بے سہارا سمجھ کر غلط سمجھنے اور سمجھاتے لگے ہیں ۔ آپ ہی سوچئے نا سر ! ایک مجبور ، کمزور ، ذمہ داریوں کے بوجھ سے لدی بے سہارا لڑکی خود کو ہوس ناک نگاہوں سے کب تک محفوظ رکھ سکتی ہے ؟ ،،

یہ ایک مستقل سوال تھا جس کا اس وقت میرے پاس کوئی جواب نہ تھا

میں نے اُسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا ۔

،، گھبراؤ نہیں نمرتا ! یہ دنیا تو آزمائش کی جگہ ہے ، مصائب سے گھبرا جانے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے ۔ تم اپنی سہیلی کے یہاں نہیں جانا چاہتیں تو نہ جاؤ ، اور یہیں رہو ۔ آفس سے لوٹ کر آؤں گا تو اطمینان سے باتیں ہوں گی ! ،، اور میں نوکروں کو نمرتا کو ہر سہولت بہم پہونچانے کی ہدایت کر کے آفس چلا گیا ۔

میری زندگی کا وہ پہلا دن تھا جب آفس کے کام میں میرا جی نہ لگتا تھا نمرتا ذہن پر چھائی ہوئی تھی ۔ اس کے بارے میں بہت سوچنے اور غور کرنے کے بعد

میں نے اس کا استعفاء منظور کر لیا۔ اور آفس ہی سے عظیم آباد اپنے سسرال ریکھا کو اور رانچی میڈیکل کالج ارج کو ٹرنک کال کیا کہ وہ جلد سے جلد یہاں آ جائیں، ریکھا تو اسی رات آگئی اور ارج دوسرے دن شام کو آگیا اور ایک ہفتہ کے اندر ہی وہ سب کچھ ہوگیا جس کا میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔

اوپر کے کمرے سے قہقہوں کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں اور مجھے محسوس ہو رہا تھا یہ قہقہے نہیں شہد کی بوندیں ہیں جو قطرہ قطرہ میرے کانوں میں ٹپک رہی ہیں اور میرے گرد فضا مترنم ہوگئی ہے، میں اس کیف آگیں ماحول سے مسحور ہو رہا تھا کہ ریکھا کی آواز نے سارا طلسم توڑ دیا۔

"آج آفس نہیں جانا ہے کیا؟"

میں نے ریکھا کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور پلکوں کی جنبش سے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

"کون ہے اوپر ؟" ریکھا نے آہستہ سے پوچھا۔ اور میں نے ریکھا کے کان کے پاس منہ لے جا کر سرگوشی کی۔

تمہارا بیٹا ارج اور میری بیٹی سزیتا !"

ریکھا کے ہونٹوں پر مامتا سے بھرپور مسکراہٹ پھیل گئی۔

اُوپر کے کمرے سے اب بھی ارج اور سزیتا کے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے پھول سے نکل کر ساری فضا میں خوشبو پھیل رہی ہو!

***

میں اور میرا چہرہ

آج میں آفس کچھ دیر سے پہونچا تھا۔ اپنی جگہ بیٹھنے سے پہلے چاروں طرف دیکھا
ہر چہرے کا جائزہ لیا۔ سب ٹھیک تھا۔ سب اپنے کام میں مشغول تھے، گزرے ہوئے
دنوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں کی طرح۔ لیکن جب فاروق پر نظر پڑی تو کلیجہ دھک سے
ہو گیا، ذہن کھولنے لگا، کھولتے ہوئے ذہن میں متعدد سوالات آپس میں گڈمڈ ہونے
لگے مجھ میں اتنی تاب و طاقت نہ تھی کہ سارے سوالوں سے نبٹ سکتا بلکہ صرف ایک
ہی سوال کو اہمیت دی، فاروق کا یہ چہرہ اصلی ہے یا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ ۔ ۔ یا ۔ ۔ ؟
سوال اہم تھا، مگر میرے شعور، تحت الشعور یا لاشعور میں اس ایک سوال کا کوئی
جواب نہ تھا۔ میں کچھ فیصلہ نہ کر پایا، فیصلہ نہ کر پانے کی وجہ معقول تھی۔ وہ یہ کہ کل تک فاروق
یہ نہیں تھا جو آج نظر آ رہا تھا، معاً مجھے خیال آیا، میری نظر تو کمزور نہیں ہو گئی؟ لیکن نہیں
مجھے اطمینان ہے، بلکہ یقین ہے کہ بہت کچھ ٹھیک نہ ہونے کے باوجود میری بینائی بالکل
ٹھیک ہے۔ جو چیز، جو صورت جیسی ہے ویسی ہی مجھے دکھائی دیتی ہے یہاں تک
کہ میں خود، کو بھی، اچھی طرح، دیکھ لیتا ہوں۔ مجھے خود سے یہی ایک شکایت ہے کہ
خود کو "اچھی" طرح کیوں دیکھ لیتا ہوں اس طرح یا اس نظر سے کیوں نہیں دیکھتا کہ
"اچھی" کی گنجائش باقی نہ رہے، جس طرح دنیا کے لاکھوں اور کروڑوں انسان خود کو
دیکھتے ہیں اس لیے کبھی کبھی میں جھنجھلا جاتا ہوں، جی میں آتا ہے، سچ کی پہچان کرنے
والی ان آنکھوں کو پھوڑ لوں، کوئی ایسی شے ڈال دوں ان میں کہ یہ جو چیز، جو صورت

جیسی ہے، ویسی ہی دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جائیں، مجھے خود کو دیکھنے کا شوق نہیں بلکہ دہشت ہوتی ہے خود کو دیکھ کر اس لیے بھی کہ میری آنکھیں مجھے ہر بھیس میں پہچان لیتی ہیں لیکن ہر صبح میں خود کو دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں، نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اپنا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب میں کسی گھٹیا بلیڈ کے کند دھاروں سے چہرے کی بے ترتیبی کو ترتیب دینے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں اور کم بخت میرا آئینہ مجھے میرے سامنے کھڑا کر دیتا ہے، اور میں اپنا چہرہ کھرچتے ہوئے سوچنے لگتا ہوں میری نظروں کی طرح میرا یہ آئینہ بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ حالانکہ آج کل کے آئینے بھی جھوٹ بولتے ہیں، صرف جھوٹ ہی نہیں بولتے سحر زدہ بھی کر دیتے ہیں۔ اس طرح کہ خود کو دیکھنے والا اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس جیسا کوئی ہے ہی نہیں! اور میرا یہ آئینہ میرے "میں" کو ویسا ہی میرے سامنے کھڑا کر دیتا ہے جیسا میں ہوں یا ہوتا ہوں۔

آج ہی صبح کی تو بات ہے، میں آئینے کے سامنے کھڑا اپنے چہرے کی مرمت کر رہا تھا کہ نظر داہنی طرف مڑ گئی۔ ——— ذہن میں دور کہیں جھناکا ہوا جیسے کوئی شیشہ ٹوٹا ہو اور شیشے کی کرچیں میرے وجود کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی ہوں۔ حال پر ماضی کی ضرب اتنی ہی شدید تھی کہ میں تلملا گیا، دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں ——— داہنی طرف لکھنے کی میز تھی اور میز پر "میں" موجود تھا۔ چاندی کی طرح چمکتے ہوئے فریم میں، شفاف شیشے کے پیچھے سے جھانکتا ہوا "میں"، پھول کی طرح کھلا ہوا شاداب، خوبرو اور مسرور "میں"! میری نگاہیں زیادہ دیر تک لکھنے کی میز والے "میں" پر ٹک نہ سکیں اور پلٹ آئیں۔ میں نے اپنے دوسرے "میں" کو دیکھا جو کچھ دیر سے میرے سامنے تھا۔ جسے میرے آئینے نے میرے سامنے لا کھڑا کیا تھا، اور پھر میرے اندر جوار بھاٹا کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ کرب کے کتنے ہی نشتر میرے وجود میں پیوست ہونے لگے۔ میں مضطرب ہو گیا، اُف میرے خدا، اتنا بڑا تضاد، اتنا بڑا انقلاب، اتنا بڑا فرق! میں کیا تھا، کیا ہو گیا

لکھنے کی میز پر بھی میں ہی ہوں، پھول کی طرح کھلا ہوا شاداب، خوبرو اور مسرور اور آئینہ میں بھی میں ہی ہوں مرجھایا ہوا، تھکا تھکا سا، اُجڑا اُجڑا سا، بیمار دل جیسا، غیر صحتمند۔ میرے لب تھرتھرائے۔ میں وہ نہیں جو لکھنے کی میز پر ہوں، میں وہ ہوں جو میرے سامنے ہے میں نے چور نظروں سے لکھنے کی میز پر موجود میں کی طرف دیکھا تو محسوس ہوا وہ بھی مجھے دیکھ رہا ہے شوخ و بے باک نظروں سے، آنکھوں میں چمک بھی ہے عجیب سی، ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہے انوکھی سی، اور جیسے اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی، نہیں یہ خود فریبی ہے اس فریم میں محفوظ بھی تم ہو اور وہاں آئینہ میں بھی تم ہو۔ فرق صرف ماضی اور حال کا ہے۔ ماضی جو تھا، حال جو ہے۔ اب بھی نہ سمجھے تو پھر یوں سمجھو! تمھارے اس میں کا تعلق اس وقت سے ہے جب تم صرف تم تھے۔ کسی کے شوہر نہ تھے، تین بچوں کے باپ تھے ساڑھے چار سو ماہوار کے عوض زندگی کی گاڑی کے کل پرزے گھسنے والے کلرک نہ تھے، جب تم پر ذمہ داریوں کا کوہ گراں نہ تھا۔

اور میں چیخ پڑا۔ نہیں! میں تم نہیں ہوں، میں یہ ہوں جو میرے سامنے ہے، تم خواب ہو اور یہ میرے سامنے حقیقت ہے۔

اور جیسے فریم میں اپنی تمام تر رعنائیوں اور دلنوازیوں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے میں نے سرگوشی کی۔ اگر تم حقیقت ہو تو ہر صبح گھر سے آفس جاتے وقت اپنا چہرہ کیوں بدل لیتے ہو؟ لباس کی طرح صاف ستھرا بے داغ۔ میں بُری طرح چونک گیا۔ صبح کے اس حادثہ میں کھو کر میں اپنا چہرہ گھر تو نہیں بھول آیا کیوں کہ جب میں کسی سوچ میں گم ہوتا ہوں تو سب کچھ بھول جاتا ہوں، خود کو بھی اور آج گھر سے نکلنے سے پہلے سب کچھ بھول جانے کیلئے سوچ کا ایک سرا ہاتھ آگیا تھا، میں نے احساس کی انگلیوں سے اپنے چہرے کو ٹٹول کر دیکھا اور اطمینان کی سانس لی میرا چہرہ میرے چہرے پر موجود تھا جو میرا ہوتے ہوئے بھی میرا نہیں تھا۔

اکثر ایسا ہوا ہے، جب میں یہ دوسرا اور نمائشی چہرہ لگا کر گھر سے باہر نکلتا ہوں،

تو محسوس ہوتا ہے کتنی ہی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ میرا مذاق اُڑا رہی ہیں اور تب ایک ہی آواز میرے گرد منڈلانے لگتی ہے۔ بہروپیا —— بہروپیا —— بہروپیا!

اور میں مسکرانے لگتا ہوں۔ کبھی کبھی قہقہے بھی لگانے لگتا ہوں، یہ اور بات ہے کہ مسکرانے اور قہقہے لگانے کی جدّوجہد میں جسم کا سارا خون کھنچ کر چہرے پہ آجاتا ہے۔ جوڑ جوڑ کھل کر بکھرتا اور رگیں ٹوٹتی ہوئی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اس بے انتہا کرب کے باوجود میں خود کو مطمئن کرنے کی سعی کرنے لگتا ہوں، کیوں کہ میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں، بہت مجبور ہوں۔ اگر میں مجبور نہ ہوتا تو آج معاشرے میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ اور میں تیسرے درجے کا آدمی ہو کر رہ جاتا۔ ذلیل، کمینہ، بے وقعت اور پتہ نہیں کیا کیا۔ مختصر یہ کہ بے چہرگی کی اس بھیڑ میں چہرہ بدل کر گھر سے نہ نکلوں تو پہچانا نہ جاؤں اپنا بھرم قائم نہ رکھ سکوں۔

اور آج میں فاروق کا بھرم پاش پاش ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جی میں آیا اُس سے پوچھوں یہ کیا سوانگ بھرا ہے تم نے؟ آج یہ کیسا چہرہ لگا کر آئے ہو تم؟ جیسے آگ برساتے ہوئے سورج کے نیچے تپا ہوا ریگستان، بے آب وگیاہ، نہ طمانیت، نہ نمو! لیکن میں کانپ گیا، کہیں میرے اس ایک سوال کے کئی جوابات نکل آئے تو؟

لیکن جب فاروق مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر چہرہ لٹکائے خاموش میرے سامنے سے گزرنے لگا تو میں نے اس کا راستہ روک لیا۔

"میرے دوست، کل تک تو تم کچھ اور تھے۔ قابلِ رشک، پر آج تمھارا یہ چہرہ ....!"

اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں کانپ گیا۔ الفاظ حلق ہی میں دم توڑ گئے۔ پھر اُس کے ہونٹ مسکرائے۔ اس طرح جیسے دنیا کا سارا زہر ایک مرکز پر سمٹ آیا ہو۔ پھر اس نے ہونٹوں کے زہر کو چوس لیا۔

"یہی میرا اصلی چہرہ ہے دوست، کل تک جو چہرے میں میرا اصلی چہرہ نہیں تھا۔"

میں کچھ سمجھا نہیں! میں نے ڈرتے ڈرتے اُسے کریدنے کی کوشش کی۔

اس نے ایک لمبی اور سلگتی ہوئی سانس لی۔ پھر خود کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کہا

"یہ ایک طویل کہانی ہے۔ جو میری پیدائش سے چھ ماہ قبل سے شروع ہوتی ہے۔"

"یار پہیلیاں نہ بجھاؤ!" میں نے نڈر بنتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو ایک بات بتاؤ، تم اس آدمی کو کیا کہو گے، کیا سمجھو گے جو عالم وجود میں آنے سے چھ ماہ قبل یتیم ہو گیا ہو، اور جس کو جنم دینے سے دس منٹ قبل ہی اس کی ماں نے دنیا سے ناطہ توڑ لیا ہو، جس کا وجود ایک تیز نشتر کا مرہون منت ہو جس نے کیڑے مکوڑے کی طرح رینگ کر بچپن کے دن گزارے ہوں، جس نے اپنی زندگی کی بنا خود ڈالنے کے لیے زمانے کے ہر ستم تنہا سہے ہوں اور پھر بھی کل تک ہنستا مسکراتا نظر آتا رہا ہو اور آج جس کی شریک حیات زندگی کے ناہموار راستوں پر اُس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے چلتے، اس کا غم بانٹتے بانٹتے اس قدر نڈھال و نحیف ہو گئی ہو کہ ضبط کی تاب نہ لا کر خون تھوکتی ہو۔ اور موت کی دہلیز پر کھڑی حسرت و یاس کے عالم میں اسے الوداع کہہ رہی ہو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور وہ انتہائی کرب بے چینی اور اضطراب کے عالم میں اپنی شریک حیات کو خود سے رخصت ہوتے دیکھ رہا ہو، اُسے روک نہ سکتا ہو، کچھ نہ کر سکتا ہو! اس لیے کہ علاج قیمتی ہے ...."

فاروق کی آواز رقت انگیز ہو گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ میری آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں، کچھ کہنے کے لیے خود کو آمادہ کر رہا تھا کہ فاروق کی سنبھلتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"بولو نا کیا کہو گے، کیا سمجھو گے ایسے آدمی کو؟"

میری پلکوں پر ٹھہرے ہوئے قطرے ڈھلکنا ہی چاہ رہے تھے کہ فاروق نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔

"اپنا چہرہ سنبھالو دوست، ایسا نہ ہو کہ یہ آنسو اس کی شگفتگی کو۔ اس خوشحالی کو دھو دیں جس کے پیچھے تمہارا اپنا چہرہ چھپا ہے، میرے اس چہرے کی طرح۔۔"

میں چونک گیا، اور خود کو، اپنے چہرے کو سنبھالنے اور مسکرانے کی کوشش

کرنے لگا۔ مسکرا دینے کی اس کوشش میں اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر رہیں، ہر طرف خون ہی خون
اُبلتا رہا۔ !!!

★ ☆

معصوم سی

اپنی نئی نویلی سہیلی شانو کے ساتھ آج وہ پہلی بار کلب جا رہی تھی، سرو قد صندلی جسم پر چاندی جیسی تارکشی کی کامدار ہلکے گلابی رنگ کی ہیری کاٹ کی ساڑی اور بلاؤز، گلے میں ترشے ہوئے سُرخ بڑے نگ کی لاکٹ والی بڑی بڑی سومی موتیوں کی نکلس، کانوں میں سرخ بُندے، کلائیوں میں جھلمل کرتی دو دو طلائی چوڑیاں، پاؤں میں اونچی نوکیلی ایڑی کا ناٹن کا سفید جالی دار سینڈل، نہایت ہی اہتمام سے کھینچی ہوئی ٹیڑھی مانگ اور دائیں آنکھ سے اوپر گھونگھے دار بالوں کی ایک لٹ، پتلے پتلے رس بھرے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ہلکی تہہ۔ بے داغ اور چکنے رخساروں پر اسنو، پاؤڈر پر انتہائی چابکدستی سے کس کیا ہوا روز۔ اور بڑی بڑی نشیلی آنکھوں میں کاجل کی پتلی لکیریں!

آج وہ بلا کی حسین معلوم ہو رہی تھی، کپڑوں کے انتخاب اور میک اپ میں اگر شانو اُس کا ہاتھ نہ بٹاتی تو اس کا حسن اتنا نہ نکھرتا، ان تمام فتنہ سامانیوں سے سج دھج کر جب وہ قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی تو خود ہکا بکا رہ گئی اور شانو کی طرف مُڑتی ہوئی شوخی سے بولی۔

"دیکھو تو کیسی لگ رہی ہوں؟"

"قیامت معلوم ہوتی ہو میری جان قیامت۔ بس جو دیکھے وہ مر ہی تو مٹے!"

شانو نے ایک بازاری عاشق کی طرح سینے پہ ہاتھ مارا

"چپ بے شرم!" نوشابہ جھینپ گئی۔

"سچ کہتی ہوں، تمھیں دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو جائیں گی سب کی!"

"یہ بات ہے تو پھر میں نہیں جاتی!" نوشابہ اٹھلائی۔

"اب تو نہیں، چلو بھی پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے!" اور شانو نوشابہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی باہر لیتی چلی گئی، جہاں شانو کی ٹی ایٹ کلب جانے کے لیے ان کا انتظار کر رہی تھی۔

کھنکتے ہوئے پیمانے گردش کرنا بھول گئے، انگلیوں میں دبے ہوئے سگرٹ ہونٹوں تک جاتے جاتے رک گئے، قہقہے لگاتے ہوئے چہروں پر حیرت و سنجیدگی طاری ہوگئی اور بے شمار نگاہیں نوشابہ کی طرف اٹھ گئیں۔

اپنے جسم کے مختلف حصوں پر ان گنت نگاہوں کی چبھن محسوس کر کے نوشابہ کچھ گھبرائی اور نگاہیں نیچی کرلیں۔

"قیامت ہے!"

"شعلہ ہے!"

"بلا کی حسین ہے!"

"اُف یہ آنکھیں!"

"ساری مستی شراب کی سی ہے!"

ہلکی ہلکی سرگوشیاں ہونے لگیں۔ نوشابہ کے پیر تھرتھرانے لگے وہ اور گھبرا گئی۔

"ہائے اللہ میں کہاں آگئی؟" وہ شانو کی طرف کھسک گئی۔ "مجھے وحشت ہو رہی ہے، واپس لے چلو مجھے!"

"گھر کی چہار دیواری میں رہتے رہتے تمھیں قید و بند کی زندگی راس آگئی ہے زندگی کا لطف چاہتی ہو تو کھلی ہوا میں پرواز کرو!" شانو نے سرگوشی کی۔

"لیکن میرے بال و پر جواب دے رہے ہیں، دیکھتی نہیں کتنی حرص و ہوس ہے ان نگاہوں میں!"

شانو ہنس پڑی "تم غلط سمجھی ہو۔ یہ متحیر نگاہیں تمہارے حسن کی تعریف کر رہی ہیں تمہارا استقبال کر رہی ہیں!"

"نہیں نہیں شانو! میرا دم گھٹ جائے گا، واپس چلو!"

"بالکل گنواروں جیسی باتیں کرتی ہو، تھوڑی دیر اس ماحول میں رہو۔ پھر تم بھی میری طرح یہاں کی ایک ایک چیز سے مانوس ہو جاؤ گی۔ اور ایسی پارٹی روز روز تھوڑے ہی ہوا کرتی ہے۔ اور ابھی تو تمہیں اپنے میزبان سے ملنا ہے، دیکھنا کتنی گرینڈ پرسنالٹی ہے اُس کی اور ......" شانو کی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ پرویز کی آواز نے انہیں اپنی طرف مخاطب کیا۔

پرویز کی جاذب نظر شخصیت، فراخدلی اور دولت کی فراوانی نے اسے پرویز سے پرنس بنا دیا تھا۔

"ہیلو شانو!"

"ہیلو پرنس! بھئی معاف کرنا، ان کی وجہ سے کچھ لیٹ ہو گئی!" شانو نے نوشابہ کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ کی تعریف؟" پرنس نے نوشابہ کی طرف پُر اشتیاق نظروں سے دیکھا

"نہیں پہچانا، یہی تو ہیں تمہاری نادیدہ مہمان نوشابہ!"

"ونڈرفل! دی گریٹ!" پرنس نے ٹٹولنے والی نظروں سے سر سے پیر تک نوشابہ کا جائزہ لیا۔

"زہے نصیب، بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر!" پرنس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

غیر ارادی طور پر نوشابہ نے اپنا ہاتھ پرنس کے ہاتھ میں دیدیا۔

"شانو کی زبانی آپ کی تعریفیں سن سن کر اشتیاق ہوا کہ میں بھی آپ سے ملوں۔ آپ کی بڑی مداح ہے یہ شانو!"

"بکواس کی ہو گی اس نے، ورنہ میں کس قابل ہوں!" نوشابہ کی آواز کانپ رہی تھی

اس نے محسوس کیا، پرنس کے ہاتھ کے لمس سے اُس کے شریانوں میں خون کی روانی بڑھتی جا رہی ہے۔

"آیئے آپ کا تعارف تمام دوستوں سے کرادوں!" اور پرنس شانوز کا خیال کیے بغیر نوشابہ کو لے کر ڈانسنگ فلور پر نصب مائک پر آ گیا۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! — آج کلب کے پرمسرت سالانہ جشن کے موقع پر ایک نئی خوبصورت ممبر سے آپ کا تعارف کراتے ہوئے میں بے حد خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ آپ ہیں ہمارے کلب کی نئی اور خوبصورت ممبر نو..... شابہ!"

تالیوں کی آوازوں سے کلب کا وسیع و عریض ہال گونج اُٹھا۔ لیکن صرف دو ہاتھ ان تالیوں میں شریک نہ تھے اور وہ ہاتھ تھے بڑی بڑی نیلی آنکھوں والی یاسمین کے جو کینہ توز نظروں سے نوشابہ کو گھور رہی تھی۔ نہ جانے کیوں!

اور پھر پرنس کی طرف سے دی گئی پارٹی کی کارروائی شروع ہو گئی۔

ڈرنک!

رقص!!

سُرور!!!

قہقہے!!!!

اور آرکسٹرا کی مدھر دھنیں مستی بکھیرنے لگیں۔

حسین جوڑے تھرکنے لگے۔

سانسوں کا تبادلہ ہونے لگا۔

شانوں پر زلفیں بکھرنے لگیں۔

باہوں کے حلقے تنگ ہوتے گئے

کپکپاتے ہونٹوں کی لپ اسٹک ہلکی ہونے لگی۔

"آیئے ہم بھی چلیں!" پرنس نے آخری پیگ لیتے ہوئے نوشابہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں!" پرنس کی اس بے تکلفی پر نوشابہ ذرا سہمی۔

"کیوں؟" پرنس نے مخمور آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں ڈانس نہیں جانتی"

"کوئی بات نہیں! میں سکھا دوں گا۔ اور وہ پرنس کے ساتھ ڈانس فلور پر کھنچتی چلی گئی۔

"بایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھئے، یوں، اور یہ دایاں ہاتھ میرے ہاتھ میں دیجئے، ایسے! اب ذرا کھسک آئیے، میرے قریب، ارے آپ تو خواہ مخواہ شرما رہی ہیں! اور پرنس نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیا۔ "ذرا اور قریب ڈیمی گڈ!! آپ تو بہت جلد سیکھ جائیں گی۔" اور پرنس کی گرم گرم سانسیں اس کے رخساروں کو چھونے لگیں۔

۔ اور پھر وہ رنگین و کیف آگیں پروگراموں کے لامتناہی سلسلوں میں ڈوبتی چلی گئی۔ اور جب ابھری تو اپنے آپ سے بے گانہ ہو چکی تھی، اُسے اپنے گھر کا ماحول اجنبی معلوم ہو رہا تھا، جہاں صرف گھٹن ہی گھٹن تھی، اُداسیاں ہی اداسیاں تھیں بیڈ روم، ڈرائنگ روم، باتھ روم، کچن، فرنیچر ساری چیزیں فرسودہ معلوم ہو رہی تھیں بے کیف، بے رنگ، اور فیروز کا وجود ایک بے رستا ہوا پھوڑا معلوم ہونے لگا تھا۔ اُف یہ فلسفے کا پروفیسر، خشک، خاموش، جیسے پتھر، توبہ، یہ بھی کوئی زندگی ہے۔!!!

اور یہ کلب، عیش و مسرت کی آماجگاہ، قہقہے، خوشیاں!! اُمنگیں!!!

دن گزرتے رہے ——

اب وہ میک اپ اور کپڑوں کے انتخاب میں شاذ کی محتاج نہیں تھی اُسے دل لُبھانے کے سارے انداز آگئے تھے، جسم کے خطوط کی نمائش میں مدد دینے والے چُست کپڑوں کی اچھی پہچان ہو گئی تھی، گداز کولھوں، سڈول بازوؤں پر زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔ شباب اور شباب کی اُمنگوں کو دیر تک قائم رکھنے کے لیے میڈیکل

بےجھجک اپ کی اہمیت محسوس کرنے لگی تھی، چال میں ہواؤں میں تیرنے کا سا انداز پیدا ہو گیا تھا۔

وہ اتنی اسمارٹ ہو گئی تھی کہ سینے سے ڈھلکے ہوئے آنچل کو ہاتھوں پر سنبھالے اس بات سے بالکل بے خبر رہتی کہ اُس کا یہ انداز دوسروں کے احساس کو گدگدا رہا ہے، وہ فلمی، سماجی اور سیاسی موضوع کے علاوہ اغوا اور ریپ جیسے موضوع پر اس طرح لہک لہک کر باتیں کرتی کہ لوگ حیرت زدہ رہ جاتے۔ رمی، برج اور فلش کھیلتی تو تاش کے پتے کو پھینکتے وقت کلائی کو اس طرح جھٹکتی کہ مقابل کو کھیل ختم ہونے سے پہلے اپنی ہار کا یقین ہو جاتا، نقرئی گھنٹیوں کے ترنّم سے ہم آہنگ قہقہے لگاتے وقت اس طرح جھوم جھوم جاتی جیسے پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی ہوا کے جھونکے سے لچک لچک جائے۔ پرنس کے ہونٹوں سے دبے ہوئے سگریٹ سے اپنا سگریٹ اس طرح سلگا لیتی کہ فضا میں ایک چنگاری بھی نہ بکھرتی۔

—— آج وہ اُداس تھی، مغموم، بجھی بجھی سی۔ آنکھوں میں رنج و غم کی جھلک چہرے پر حزن و ملال کے آثار نمایاں۔ آرکسٹرا کی دھنیں رگ و پے میں طوفان برپا کر رہی تھیں۔

حسین جوڑے تھرک رہے تھے۔

اور وہ کلب کے وسیع ہال کے ایک گوشے میں تنہا پرنس کے انتظار میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ——

فیروز، چھ سو روپے ماہوار پانے والا پروفیسر۔ مفلس، مجبور، عیش و آرام کی زندگی سے بے بہرہ، میری خوشیوں کا دشمن، میرے بال و پر کاٹ دینا چاہتا ہے گھر کی چہار دیواری میں قید رکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ مجھ میں گھن لگ جائے، میں مدقوق ہو جاؤں، گھٹ گھٹ کر مر جاؤں، نہیں، میں ایسا نہ ہونے دوں گی! میرا اور فیروز کا کیا میل؟ کتنا فرق ہے ہم دونوں میں —— کاش پرنس فیروز ہوتا یا فیروز پرنس۔

اور وہ پرنس کے خیالوں میں کھو گئی۔

کتنی گرینڈ پرسنالٹی ہے ظالم کی! وجیہہ اور شکیل، وسیع النظر، وسیع القلب، خوش مزاج، خوش کلام، قہقہے ہونٹوں کے غلام، صحت مند اور صد سے زیادہ دولت مند — وہ پرنس کے خیالوں میں کھوئی تھی کہ پشت پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے چونک پڑی۔ پرنس اُس کے پیچھے کھڑا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شوخی لیے!

"ہیلو ڈارلنگ! کس سوچ میں ہو؟"

"سوچتی ہوں زندہ رہنے کے لیے کون سا راستہ بہتر ہے! فکر و پریشانی کا یا خوشیوں و مسرتوں کا!"

"زندگی کے یہی تو اُصول ہیں، کھاؤ، پیو اور خوش رہو، مر مر کے جینے سے کیا حاصل لیکن آج تم یہ سب کیوں سوچ رہی ہو؟"

"اس لیے کہ اب میں تنگ آ گئی ہوں، گھر کی زندگی سے، بس گلے، شکوے، پابندیاں اُفّو!"

"بس اتنی سی بات کے لیے اتنی فکر مند ہو۔ میرے بازوؤں میں آ جاؤ تمھاری پسند کی ہر چیز یہاں!" پرنس نے اپنے بازو نوشابہ کے سامنے پھیلا دیے۔

تیسرا پیگ خالی کر کے پرنس نے کہا۔ "ڈارلنگ میں بہت جلد ایک لمبی تفریح پر جانے والا ہوں، ساتھ دوگی میرا؟"

"کہاں؟"

"بیروت، لندن، نیویارک، پیرس اور کئی ایک جگہ"

"سچ؟" نوشابہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ہاں! بالکل سچ ڈارلنگ! تم میرا ساتھ دو تو مزہ آ جائے۔ خوب گزرے گی جو.......!"

— آرکسٹرا کی دھنیں فضا میں تحلیل ہو رہی تھیں۔

حسین جوڑے تھرک رہے تھے۔

ایک گوشے میں بیٹھی سراپا قیامت بنا، فیشن کی دلدادہ، بڑی بڑی نیلی آنکھوں

والی یاسمین پرنس کو بڑا اشتیاق اور نوشابہ کو کینہ توز نظروں سے گھور رہی تھی۔

نوشابہ اور پرنس بہت دیر سے والز ناچ رہے تھے۔ دونوں کیف و سرور کی گہرائیوں میں ڈوبتے جا رہے تھے ناچتے ناچتے نوشابہ پرنس کے بازو پر ترچھی ہو کر ڈھلک گئی، کمان کی طرح۔

"تھک گئی ہو کیا؟" پرنس نے اُسے سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ہاں بہت تھک گئی ہوں میں۔"

"آؤ پھر چلیں!"

"پرنس! کیا تم میرا بوجھ اُٹھا سکو گے؟"

"یہ بھی کہنے کی بات ہے، تم مجھے موقع تو دو!"

"تو پھر مجھے اپنے بازوؤں میں ہی رہنے دو، ہمیشہ ہمیشہ۔"

"او ہو ڈارلنگ میں تو کب سے انتظار کر رہا تھا اس ایک جملے کا۔"

"کتنے اچھے ہو تم، دی گریٹ فیلو رنس کے بازوؤں کے لمس اور رم کے کیف آگیں سرور سے وہ بہکنے لگی۔

"کل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آجاؤں گی۔ فیروز کی قید سے آزاد ہو کر!"

"فیروز؟" پرنس چونکا۔

"ہاں فیروز! جو میری مرضی کے خلاف میرا سب کچھ ہے۔"

"تم اپنے شوہر کی بات کر رہی ہو؟" پرنس کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

"شوہر نہیں، صیاد کہو اُسے صیاد!" وہ مدہوش ہوتی گئی۔

"لیکن . . . لیکن تم نے پہلے کبھی نہیں بتایا" پرنس کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی۔

"چھوڑو بھی، اب نام نہ لو اس کا، میں سب کچھ بھول جانا چاہتی ہوں۔ مائی سویٹ فیلو

—— وہ خوش تھی۔ آج سے نئی، عشرتوں سے بھرپور، مسرتوں سے ہمکنار، زندگی کا آغاز ہونے والا تھا۔ وہ خوش آئند مستقبل کے حسین و دلکش تصور میں ڈوبی پرنس کا انتظار کر رہی تھی — وہ فیروز، اور فیروز کے ساتھ گزرے ہوئے پانچ سال کی طویل مدت، سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔ آج اُس نے فیروز سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس کی زندگی کے کسی بھی گوشے میں ایڈجسٹ نہیں ہو سکتا، دونوں کی نباہ مشکل ہے، اور اُس کی ساری باتوں کے جواب میں فیروز نے صرف ایک ہی جملہ کہا تھا۔

"میں ہر صورت تمھاری خوشی چاہتا ہوں!"

آٹھ، پرنس اب آتا ہی ہوگا۔

نو، اب تک آجانا چاہیے۔

دس، وہ اب تک کیوں نہیں آیا۔ اتنی دیر تو کبھی نہ ہوئی۔ نوشابہ کی الجھن بڑھ گئی۔

گیارہ، کلب کی چہل پہل میں کمی ہونے لگی تھی۔ آرکسٹرا کب کا خاموش ہو چکا تھا۔ حسین جوڑے تھک کر نڈھال ہو گئے تھے۔ پیمانوں کی کھنک پر سکوت کا پہرہ لگ گیا تھا۔ بوتلیں خالی پڑی تھیں، قہقہوں پر نشہ آلود سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ —— وہ نا امیدیوں کی عمیق گہرائیوں میں ڈوبتی جا رہی تھی کہ اُسے شانو نے جھنجھوڑ دیا

"گھر نہیں جاؤ گی کیا؟، کب تک پرنس کا انتظار کرو گی، گیارہ بج گئے!"

"وہ آج کیوں نہیں آیا؟" نوشابہ کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔

"اب وہ مہینوں نہ آئے گا!"

"کیوں؟" وہ متحیر ہو گئی۔

"آج وہ دن کے پلین سے یورپ چلا گیا، تنہا نہیں اُس کے ساتھ یاسمین بھی ہے!!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے"، نوشابہ اس طرح چونکی جیسے زمین اس کے پیروں تلے

سے نکل گئی ہو۔

"کیوں نہیں ہو سکتا، اور ہونے کے لیے کیا یہ کم ہے کہ تم مسز ہو اور یا مین مس!"

"تو کیا پرنس نے مجھے فریب دیا؟" وہ نڈھال ہو گئی۔

شائلہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "ہماری اس اونچی سوسائٹی میں محبت، وعدے اور فریب نام کی چیزیں نہیں، یہاں جذبات کی قدر نہیں، جذبات کی تسکین کی جاتی ہے، جس سے جب تک جی چاہے دل بہلایا جائے اور بس — آؤ چلیں!"

سپنے بکھر گئے۔ خیالوں کا شیش محل مسمار ہو گیا۔ تو شابہ ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ پرنس کا تصور اس کے ذہن کو جھنجھوڑتا رہا، گزرے ہوئے دنوں کی یادیں تڑپاتی رہیں، سوال، ماضی کو کریدتا رہا اور جب رات کے پچھلے پہر نیند آئی تو گیارہ بجے دن تک سوتی رہی۔ آنکھیں کھلیں تو ہر طرف اُداسی اور ویرانی بکھری ہوئی تھی فیروز کالج جا چکا تھا۔

آج وہ محسوس کر رہی تھی گھر کا ماحول اُس کے لیے اجنبی نہیں، وہ خود اس ماحول سے اجنبی ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر درد و کرب کی بے شمار لکیریں اُبھر آئیں اور وہ ایک بار پھر سوچ اور فکر کے لامحدود راستے پر چل پڑی — اور جب خیالوں سے چونکی تو پانچ بج چکے تھے۔

اب وہ آتے ہی ہوں گے! اور وہ بہ عجلت تیار ہو کر انتظار کرنے لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں فیروز کمرے میں داخل ہوا، فلسفے کا پروفیسر، ہر وقت خیالوں میں ڈوبا رہنے والا، خشک، خاموش!

وہ اُٹھی اور فیروز کا کوٹ اُتارنے لگی۔

"آج تمھیں میرا خیال کیسے آ گیا؟" فیروز نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"مجھے معاف کر دیجیے!" وہ بدقت تمام کہہ سکی۔ نگاہیں بارِ ندامت سے

جھک گئیں۔

اور فیروز نے اُسے بازوؤں میں لے لیا جیسے وہ کوئی گڑیا ہو، ننھی مُنی،

بے داغ، معصوم سی!!!

★★★

بے داغ چہرہ

شام شب سے گلے مل رہی تھی۔

سڑک پر ٹریفک کی آمدورفت تھی، فٹ پاتھوں پر آنے جانے والوں کا ریلا تھا۔ تیز روشنیوں میں ڈوبی، جگمگاتی دکانوں پر گاہکوں کی — زندگی ہر طرف رواں دواں تھی۔

وہ گرد و پیش کا جائزہ لیتا اور دشیم کی طرف بڑھ رہا تھا کہ نظر دائیں طرف، فٹ پاتھ پر آنے جانے والوں سے گزر کر سہاگ سدن پر پڑی، اس کے قدم ٹھٹھک گئے، محسوس ہوا جیسے اُسے کہیں دیکھا ہو، پر کہاں؟ یہاں اُس کا ذہن تاریک تھا اُس نے سوچا یہاں سے چہرے کا صرف دایاں ہی حصہ نظر آتا ہے، پورا چہرہ دیکھوں تو شاید یاد آجائے۔ وہ فٹ پاتھ سے اتر کر سہاگ سدن کی طرف دیکھتا سڑک پار کرنے لگا۔ اچانک وہ چونک گیا۔ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ جب تیز رو کار سامنے سے گزر گئی تو دوڑ کر سڑک پار کی اور سہاگ سدن کے قریب پہونچا، لیکن — کاؤنٹر خالی تھا۔ سیلزمین کاؤنٹر پر بکھری چوڑیوں کو ڈبوں میں سجا رہا تھا۔ اُس نے سامنے دیکھا۔ کریپ نیالٹ سے فیروزی ساڑی جھانک رہی تھی، وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ کار متحرک ہوئی، کچھ بائیں مڑی اور سیدھی ہو کر سڑک پر دوڑ گئی۔ وہ جاتی ہوئی کار کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے کار کی پچھلی سرخ روشنی اس کا منہ چڑھا رہی ہو — یہ چند لمحے اس کے ذہن پر لذت بخش کی طرح چھا گئے، اور دشیم کی طرف بڑھتا ہوا

سوچنے لگا۔ کون تھی وہ؟ ایسا کیوں محسوس ہوا جیسے کہیں دیکھا ہو اُسے؟ ذہن کے تاریک گوشے روشن نہ ہوئے تو اُس نے ذہن کو جھٹک دیا۔ ہوگی کوئی لیکن نہیں، متناسب قد و قامت اور دلکش خد و خال والی فیروزی ساڑھی میں ملبوس وہ عورت جیسے اُس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی ہو۔

اور وہ شیم کی لذیذ کافی کے ہلکے ہلکے گھونٹ کے ساتھ وہ ذہن کے بند دریچوں کو کھولنے لگا، ایک کے بعد ایک، بھولی بسری صورتیں سامنے آنے لگیں۔ —

اور — ذہن کا ایک تاریک گوشہ اچانک روشن ہوگیا۔ اُسے یاد آنے لگا سات سال پہلے کا وہ زمانہ جب وہ مظفر پور میں تھا اور وہ کافی کے گھونٹ کے ساتھ سات سال پیچھے لوٹنے لگا۔

— جس فلیٹ میں وہ رہتا تھا اُس کے بالائی حصے میں نیشنل بینک کے مینیجر مسٹر ماتھر بھی رہتے تھے۔ قریب رہنے کی وجہ سے دونوں میں اچھی جان پہچان ہوگئی تھی۔ اُس نے مسٹر ماتھر کو اکثر ہنستے، مسکراتے اور قہقہے لگاتے دیکھا تھا۔ اس کے برعکس جب اُس کی نظر مسز ماتھر پر پڑی تھی تو اُس نے اُنھیں اداس اور مضمحل پایا تھا۔

ایک شب — وہ پہلی بار مسٹر ماتھر کے یہاں کھانے پر مدعو تھا۔ پُر تکلف کھانے پر مدعو تھا۔ پُر تکلف کھانے سے فراغت کے بعد دونوں مُلک کی موجودہ سیاسی پالیسی پر گفتگو کر رہے تھے کہ مسز ماتھر دونوں ہاتھوں میں کافی کی پیالیاں لیے اندر آئیں اور دونوں کے سامنے رکھ کر ماتھر کے قریب صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اُس نے پہلی بار مسز ماتھر کو بہت قریب اور غور سے دیکھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے یہ چہرہ مسز ماتھر کا اپنا چہرہ نہ ہو، آنکھوں میں اُداسیوں کے لہراتے ہوئے سائے تھے، چہرے پر شگفتگی تھی نہ تازگی، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ہر وقت کچھ سوچتی رہتی ہوں۔ کوئی غم، کوئی فکر اندر ہی اندر اُنھیں ستاتی رہتی ہو۔ اپنی سوچ سے قطع نظر مسٹر ماتھر کو مخاطب کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

"مسٹر ماتھر، خوش نصیب ہیں آپ جو اتنی اچھی، سلیقہ مند اور وفا شعار شریکِ حیات ملیں آپ کو!"

"جی ہاں، کہنے کو تو بہت خوش نصیب ہوں جو اتنی اچھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ماتھر نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ اور مسز ماتھر کی طرف دیکھا۔

اُسے ماتھر کی اِس ادھوری بات کا انداز کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ مسز ماتھر کی طرف اُن کے دیکھنے کے انداز نے اُسے اور بھی متحیر کر دیا، اس لیے کہ ماتھر کی آنکھوں میں اپنی بیوی کے لیے پیار، چاہت یا لگاؤ جیسے کسی جذبے کی کوئی جھلک نہ تھی، اس نے مسز ماتھر کی طرف دیکھا تو خوف کی ایک لہر اس کے اندر رینگ گئی، مسز ماتھر نے نی نظریں اس طرح جھکالیں تھیں، جیسے ماتھر کی طرف دیکھنے کی تاب نہ ہو اُن میں۔ اُن کے چہرے پر اُداسیوں اور مایوسیوں کے مہیب سایے اتنے گہرے ہو گئے تھے کہ اُن کا دلکش رنگ و روپ اُس مہیب سائے میں ڈوب گیا تھا۔ وہ مسز ماتھر کی اس اچانک بدلتی ہوئی کیفیت کو محسوس کر ہی رہا تھا کہ وہ اُٹھیں، کچھ لڑکھڑائیں پھر خود کو سنبھالتی ہوئی ڈرائنگ روم سے چلی گئیں، وہ کافی کے گھونٹ کے ساتھ اس غیر متوقع صورت حال پر سوچتے ہوئے ماتھر اور مسز ماتھر کے درمیان کشیدگی کی وجہ جاننے کی سعی کرنے لگا، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اتنا تو اُس پر ظاہر ہو ہی گیا تھا کہ ماتھر اپنی بیوی سے خوش نہیں ہیں۔ ماتھر نے اس سے پوچھا۔

"امر بابو، فیملی کیوں نہیں رکھ لیتے ساتھ؟"

اپنے خیال سے چونکتے ہوئے اُس نے کہا "فیملی تو میں ساتھ ہی رکھتا ہوں لیکن ان دنوں وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ساتھ رکھ سکوں۔!"

"کیوں، کیا ہوا اُنھیں؟" ماتھر کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور ہمدردی بھی

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا "وہی جو ہونا چاہیے۔ مطلب یہ کہ دن پورے ہیں کوئی ٹھیک نہیں آنے والا کب، کس وقت آجائے!"

"وہ!" ماتھر نے اس طرح اوہ کہا جیسے انھوں نے ایک لمبی اور گہری

سانس لی ہو۔ اُس نے محسوس کیا جیسے ماتھر کے چہرے پر چھائی ہوئی کچھ دیر پہلے کی اُداسی پھر لوٹ آئی ہو، وہ کچھ سمجھ نہ سکا، تھوڑے سے توقف کے بعد ماتھر نے کہا۔

"تب تو کھانے پینے کی تکلیف ہوتی ہوگی آپ کو؟"

"ہوتی تو ہے، لیکن کروں کیا مجبوری ہے!"

"آخر کیا انتظام کر رکھا ہے آپ نے؟" ماتھر نے پوچھا۔

"بس اتنا کہ صبح کا ناشتہ اسٹو و پر خود تیار کر لیتا ہوں اور دونوں وقت کا کھانا ہوٹلوں میں کھا لیتا ہوں۔"

ماتھر خاموش رہے، جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر بولے۔

"ایسا کیوں نہ ہو کہ ہمارا کچن آپ کا بھی کچن بن جائے۔"

"نہیں خواہ مخواہ آپ زحمت کیوں اُٹھائیں کسی طرح میرا کام چل ہی جاتا ہے"

ارے بھئی! اس میں زحمت اُٹھانے کی کیا بات ہے۔ صبح کا ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا ہمارے یہاں پکتا ہی ہے کچھ اضافہ کے ساتھ آپ کے لیے بھی پک جایا کرے گا،" "ایسا ہی ہے تو جو کچھ آپ ہوٹلوں پر خرچ کرتے ہیں اس کا نصف دے دیا کریں گے۔"

"نصف کیوں؟" وہ متعجب ہوتے ہوئے بولا۔

"ہوٹل والوں کا منافعہ وضع کر کے!" ماتھر ہنسنے لگے ان کا چہرہ صاف تھا، اُداسی کی ایک بھی لکیر چہرے پر نہ تھی، وہ بھی ہنسنے لگا پھر بڑی رد و کد کے بعد وہ ماتھر کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔

کئی دنوں تک وہ ماتھر اور مسز ماتھر کے بارے میں سوچتا رہا ان کی اداسیوں اور مایوسیوں کے سبب پر غور کرتا رہا۔ لیکن کسی نتیجے پر نہ پہونچ سکا اُسے اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ دونوں کا غم مشترک ہے۔ باہمی کشیدگی کی کوئی ایسی وجہ ہے جسے یہ کسی اور پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ وہ ماتھر سے بنا بے تکلف ہو گیا تھا

کہ کوئی بھی سوال ان سے کر سکتا تھا، اپنے کسی بھی سوال کے جواب پر اُنھیں مجبور کر سکتا تھا، لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ کہیں دونوں کے اندر سلگتی ہوئی کرب و کشیدگی کی چنگاریاں لہک اُٹھیں تو ؟ یا پھر اُس کی کسی بات کو ماتھر اپنی نجی زندگی میں مداخلت سمجھ کر اس سے بدظن ہو جائیں، اس نے اکثر یہ بھی سوچا تھا کہ کاش وہ اِن کے کام آسکتا، ان کے درمیان مصالحت کا سبب بن سکتا۔ !

ایک رات ! ——

رات کا کھانا سن رسیدہ مُلازمہ اس کے فلیٹ ہی میں لے آئی، اب تک وہ ماتھرُ کے ساتھ ان کے یہاں کھاتا رہا تھا، آج پہلی بار تنہا اپنے کمرے میں کھا رہا تھا۔ اسی طرح جیسے کھانا اس کی پسند کے مطابق نہ ہو، وہ کھانا کھاتے ہوئے سوچ رہا تھا، جاتے وقت ماتھرُ نے تاکید کی ہوگی کہ میری غیر موجودگی میں اُس کا کھانا نیچے ہی بھجوایا جائے، وہ یہ نہ چاہتے ہوں گے کہ میں اُن کی غیر موجودگی میں اوپر اُن کے یہاں جاؤں۔ اُس کے منہ کا ذائقہ بدل گیا جیسے کوئی کڑوی کسیلی چیز چبا ڈالی ہو۔ جیسے تیسے اس نے کھانا کھایا۔ جب مُلازمہ برتن سمیٹ کر چلی گئی تو وہ بھی فلیٹ کو مقفل کر کے نکل پڑا۔ لیکن چہل قدمی میں بھی جی نہ لگا، ماتھرُ کی بے اعتمادی کا خیال اُسے مضطرب کرتا رہا۔ جلد ہی لوٹ آیا، سونے کے لیے کپڑے بتدیل نہ کر پایا تھا کہ ملازمہ دروازے میں نظر آئی۔

اس کے پوچھنے پر ملازمہ نے بتایا۔ وہ مالکن کی طبیعت صبح سے اچھی نہیں تھی، بدن میں درد تھا اب بخار بھی ہوگیا ہے، انھوں نے کہا ہے آپ کوئی دوا لا دیں ! ۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے اوپر جا کر دیکھا، مسز ماتھر درد کی شدت سے بے چین تھیں، چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ جھجکتے ہوئے اُن کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اُسے اپنی ہتھیلی جلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُسے خود سے اتنا قریب دیکھ کر مسز ماتھرُ اپنے آپ میں سمٹنے لگی تھیں۔ شال میں خود کو چھپانے لگی تھیں۔ اُس نے ان سے

پوچھا۔

"کوئی دوائی ہے آپ نے؟"

"نہیں!"

"کیوں؟"

"کس سے دوا منگاؤں۔ وہ تو رام نگر چلے گئے ہیں، اُن کے جنرل منیجر کی لڑکی کی شادی ہے، تیسرے دن آنے کو کہہ گئے ہیں!" مسز ماتھر نے نحیف آواز میں اُسے بتایا۔

"مجھے معلوم ہے، آپ پریشان نہ ہوں، میں دوا لاتا ہوں۔ یہ بتائیں، بدن میں درد اور بخار کے علاوہ بھی کوئی تکلیف ہے آپ کو؟" اُس نے پوچھا

"تکلیف ۔۔۔ مسز ماتھر کے ہونٹوں پر زہر خندہ سی مسکراہٹ آئی اور چلی گئی، انھوں نے کہا "اور کوئی تکلیف نہیں"

اس نے مسز ماتھر کے زہر میں بجھی ہوئی مسکراہٹ اور لہجے کی مایوسی کو محسوس کیا، لیکن کچھ بولا نہیں، بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔ دوائیں لے کر واپس آیا تو دیکھا مسز ماتھر سوئے ہوئے اپنا سر اپنے ہی ہاتھ سے دبا رہی تھیں۔

"اپنا سر آپ دبا رہی ہیں۔ ملازمہ کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"سو گئی ہوگی، کئی بار پکار چکی ہوں، سنتی ہی نہیں۔"

اُس نے دوائیں سرہانے کی چھوٹی میز پر رکھ دیں اور جا کر دیکھا۔ ملازمہ کچن کے فرش پر بستر ڈالے خراٹے لے رہی تھی۔ ایک گلاس پانی لے کر وہ مسز ماتھر کے قریب آیا اور بولا "وہ تو بے خبر سو رہی ہے، کمبخت کو اتنا خیال نہ آیا کہ اس وقت آپ کو اس کی ضرورت ہوگی۔"

مسز ماتھر کے ہونٹوں پر ایک بار پھر زہر میں بجھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ان کے لب تھرتھرائے "جب اپنوں کو فکر نہیں تو اُسے کیا ہوگی۔ وہ تو غیر ہے!"

اُس نے پھر مسز ماتھر کے لہجے کی مایوسی اور اندر کے کرب کو محسوس کیا۔

گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں۔ اپنے طور پر اتنا ہی سمجھ سکا ہوں کہ آپ دونوں کے درمیان کچھ اختلاف ہے!"

"کچھ کیا بہت کچھ ہے۔ اور جو کچھ ہے اس کے لیے میں نہیں وہ ذمہ دار ہیں!" مسز ماتھر دونوں کہنیوں پر بوجھ ڈال کر اٹھنا چاہ رہی تھیں، ایک طرف ڈھلک گئیں۔ اُس نے جھک کر انھیں تھام لیا۔ اپنے بازوؤں پر اُس کی انگلیوں کی گرفت کو محسوس کر کے وہ جھجکیں، لیکن کچھ بولی نہیں۔ اس نے تکیہ پلنگ سے لگا کر کھڑا کر دیا۔ وہ تکیہ سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئیں۔ اُس نے اُنھیں دوائیں دیں۔ ایک ٹیبلیٹ، ایک کیپسول اور دو چمچے پینے کی دوا۔ مسز ماتھر کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے اُس نے کہا۔

"اب سو جائیے۔ کوشش کیجیے نیند آجائے۔" ایک بار پھر اُسے مسز ماتھر کو سنبھالنا پڑا۔ انھیں سلاتے ہوئے کہا۔ "مسز ماتھر۔۔۔۔!"

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولیں۔ "میرا نام معلوم نہیں آپ کو؟ رنجیتا نام ہے میرا!"

تھوڑی دیر خاموشی سے مسز ماتھر کو تکتے رہنے کے بعد اُس نے کہا۔

"رنجیتا جی، میں کہہ رہا تھا اس وقت یہاں آپ ہیں اور میں ہوں۔ تیسرا کوئی نہیں اور جبکہ آپ بیمار ہیں، آپ کو کسی کی ضرورت ہے تو پھر مجھے وہ سب کچھ کرنے دیجیے جو ایک تیماردار کو کرنا چاہیے۔!"

مسز ماتھر نے اُس کی طرف دیکھا، اُن کی آنکھوں میں اُس کے لیے تشکر تھا۔ احسان مندی کی ایک جھلک تھی۔

مسز ماتھر کے جسم پر شال پھیلاتے ہوئے اس نے کہا۔

"اب آپ کو پسینہ آئے گا، پسینہ آئے گا تو بخار بھی اُتر جائے گا، درد بھی جاتا رہے گا۔ آپ آنکھیں موند لیں میں پیشانی پر بام کی مالش کیے دیتا ہوں"

"نہیں!" مسز ماتھر نے اپنی پیشانی کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ "بہت تکلیف دے چکی ہوں اب اور نہ تکلیف کیجیے!"

"میرا بھی کچھ فرض ہے کہ نہیں؟ آپ کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوگی۔!"

مسز ماتھر مزید مزاحمت نہ کر سکیں۔ آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑی گہری گہری سانسیں لیتی رہیں وہ ان کی پیشانی اور کنپٹیوں پر بام کی مالش کرتا رہا۔

مسز ماتھر کا خوبصورت بے داغ چہرہ بخار سے تپ کر اور گلنار ہو گیا تھا، بکھرے ہوئے دراز بال چاند کے گرد پھیلی ہوئی کالی گھٹاؤں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار اس کی نگاہیں چت سوئی ہوئی مسز ماتھر کے سراپا پر پھسلنے لگتی تھیں۔ خوبصورت جسم کے دلکش اور تو بہ شکن نشیب و فراز شال کے اوپر سے بھی نمایاں تھے، گہری گہری سانسوں کی لہروں پہ سینے کی گولائیاں یوں معلوم ہو رہی تھیں جیسے چنچل موجوں پر ہچکولے کھاتی ہوئی بادبانی کشتیاں۔ وہ خود پر قابو پاتا رہا۔ جذبات انگیز خیالات کو ذہن سے جھٹکتا رہا اور اس کی انگلیاں مسز ماتھر کی پیشانی پہ پھسلتی رہیں لمحے سرکتے رہے۔

مسز ماتھر نے آنکھیں کھول دیں۔ مسکرائیں اور بولیں۔ "بس کیجیے، اب میں اچھی ہوں، بہت اچھی، بدن میں درد بالکل نہیں۔ شاید بخار بھی نہیں۔"

"اچھا تو آپ جاگ رہی ہیں!" اس کے لہجے میں تحیر تھا۔

"نیند نہیں آتی!"

"اس کا مطلب یہ ہوا ابھی آپ اچھی نہیں ہوئیں۔ اچھی ہو گئی ہوتیں تو نیند آ گئی ہوتی!"

"سچ کہتی ہوں اب میں بالکل ٹھیک ہوں، پورا جسم پسینے میں تر ہو گیا ہے، دیکھیے!" مسز ماتھر نے شال سے ہاتھ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے چھو کر دیکھا، ہاتھ پسینے سے بھیگا ہوا تھا، بخار اتر گیا تھا۔

مسز ماتھر اس کی طرف کروٹ بدل کر بولیں۔ "آپ کو نیند آ رہی ہوگی جائیے!

سو جائیے۔ رات بھی کافی گزر چکی ہے!"

اُس نے کہا۔ "مجھے بھی نیند کہاں آئے گی آپ کی طرف دھیان لگا رہے گا،"

"تو پھر کچھ باتیں کیجئے!" مسز ماتھر کے ہونٹوں پر صحت مند مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیسی باتیں؟" وہ بھی مسکرانے لگا۔

اُس نے مسز ماتھر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "رنجیتا جی! اگر آپ اجازت دیں تو آپ سے آپ ہی کے بارے میں کچھ پوچھوں؟"

"کیا —— ؟" وہ کسمسائیں۔

"یہی کہ مسٹر ماتھر اور آپ کے درمیان ایسی کون سی بات ہے جو آپ دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق سے رہتے ہیں؟" اُس نے بلا توقف وہ سوال کر ہی دیا جو سوال کرنے کے لیے بے چین تھا۔

"آپ نے اُن سے کبھی کچھ نہیں پوچھا؟" مسز ماتھر اچانک اُداس ہو گئیں۔

"نہیں!"

مسز ماتھر خاموش رہیں تو اُس نے کہا۔ "یہ سوچ کر کبھی کچھ نہ پوچھا کہ جو اپنی اتنی خوبصورت بیوی سے خوش نہ ہو وہ میری کسی بات پر خفا ہو جائے تو! یا پھر ہو سکتا ہے مسٹر ماتھر میرے کسی ایسے سوال کو اپنی گھریلو زندگی میں مداخلت سمجھ کر مجھ سے بدظن ہو جائیں!"

"ٹھیک ہی سوچا آپ نے!" مسز ماتھر نے پژمردہ آواز میں کہا۔

"تو کچھ آپ ہی بتائیے! آپ ہر وقت اداس و مضمحل کیوں رہتی ہیں؟ مسٹر ماتھر کو آپ سے یا آپ کو مسٹر ماتھر سے کیا شکایت ہے؟"

مسز ماتھر کچھ دیر خاموش رہ کر بولیں۔ "آپ نے محسوس تو کیا ہو گا کہ گھر کتنا سونا سونا سا، ویران ویران سا معلوم ہوتا ہے۔"

وہ کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بولیں "جس گھر میں بچے نہ ہوں وہ گھر ویرانہ ہی

تو ہے !"

وہ چونک گیا۔ "ارے، میں نے تو اِس بارے میں کبھی سوچا ہی نہ تھا تو کیا آپ دونوں کے درمیان کشیدگی کی وجہ یہی ہے کہ آپ —— !"

"ہاں، دس سال ہو گئے ہماری شادی کو اور ہماری زندگی کے چمن میں ایک پھول بھی نہ کھلا !" مسز ماتھر اور اُداس ہو گئیں۔

"اوہ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اس قابل نہیں کہ .... !"

وہ اپنی بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ تڑپ اٹھیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے جلے پر نمک چھڑک دیا ہے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں، مجھ میں کہیں کوئی کمی نہیں۔ کمی تو ان میں ہے، بچے نہ ہونے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں اُن پر ہے۔ میں — میں مکمل عورت ہوں !" وہ خاموش ہو کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگیں۔

وہ بھی خاموش رہا اور جب مسز ماتھر کچھ نارمل ہوئیں تو اُس نے کہا۔ "آپ کو خود پر بھروسہ ہے تو مسٹر ماتھر کو اپنی کمی کا احساس ہونا چاہیئے !"

مسز ماتھر نظریں نیچی کیے ہوئے آہستہ آہستہ کہنے لگیں۔ "ایسی بات بھی نہیں کہ وہ بالکل سرد ہوں، لیکن وہ غوطہ خور سمندر کی تہہ سے موتی کیسے نکال سکتا ہے جو سطحِ آب پر ہی مچلتی شوخ و چنچل موجوں کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا سکے اور نڈھال ہو کر ہاتھ پاؤں ڈال دے۔"

مسز ماتھر کی صاف گوئی اور انکشاف نے اُس کی زبان گنگ کر دی۔ وہ انھیں تکے جا رہا تھا کہ چند لمحوں بعد انھوں نے نگاہیں اُٹھائیں، اُسے دیکھا اور کہنے لگیں۔

"امر بابو! میری شادی کسی اور سے ہوئی ہوتی تو اب تک ہماری زندگی کے چمن میں کئی پھول کھل چکے ہوتے، لیکن افسوس، میری گود سونی ہے اور شاید سونی ہی رہے گی۔ میرے سپنوں کے آنگن میں کوئی گلاب نہ کھل سکے گا۔ میرے من میں سنّاٹا

کی خوشیوں کے دیپ کبھی نہ جلیں گے۔ اپنی کمزوری کا اُنھیں احساس بھی نہیں ہوتا سارا الزام میرے ہی سر آتا ہے۔!" مسز ماتھر سسک پڑیں۔ ہتھیلیوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگیں۔

اُس سے مسز ماتھر کا رونا دیکھا نہ گیا۔ دل میں ہمدردی کا طوفان اُمڈ آیا۔ اُس نے بڑھ کر ہاتھوں کو چہرے سے الگ کیا، اور اُن کے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں پر سنبھالتے ہوئے بولا۔

"رنجیتا جی، آپ کو یقین ہے کہ اگر آپ کی شادی کسی اور سے ہوئی ہوتی تو آپ کی زندگی کے چمن میں کئی پھول.....!"

"ہاں، مجھے یقین ہے، اور یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں خود کو جانتی ہوں، اپنے آپ کو پہچانتی ہوں۔" انھوں نے سسکیوں کے درمیان کہا۔

وہ اپنے اندر ہمدردی کے تمام جذبوں کو سمیٹتے ہوئے کہنے لگا۔

"رنجیتا جی! اگر آپ کو خود پر یقین ہے تو کسی پر بھروسہ کر کے آپ کو فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ خواہ اس کے لیے خود پر تھوڑا جبر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ کے جیون کے آنگن میں کوئی گلاب نہ کھلے، آپ کے من میں سنتان کی خوشیوں کے دیپ نہ جلیں۔ کیوں نہ آپ آج کی اس پُرسکون رات اور اس بے خوف تنہائی کو اپنا رازدار بنالیں۔"

اُس نے اور آگے بڑھ کر مسز ماتھر کے غموں سے نڈھال جسم کو تھام لیا — مسز ماتھر گھبرائیں — جھجکیں — شرمائیں — اور — اُن کی سانسیں اُلجھنے لگیں۔ انھیں محسوس ہونے لگا، جیسے اُن کے اندر طوفانی لہریں سی اُٹھنے لگی ہوں اور وہ اُن لہروں پر اس طرح بہتی جارہی ہوں جیسے تیز و تند موجوں پر ہچکولے کھاتی بادبانی کشتی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو۔ !!

اور جب پو پھٹنے لگی تو نیچے اپنے فلیٹ میں جانے سے پہلے اس نے مسز ماتھر کو دیکھا۔ وہ سو رہی تھیں، پُرسکون گہری نیند، اُس مسافر کی طرح جو مسلسل

اور طویل مسافت کے بعد منزل پہ پہونچ کر تھکن کے بھرپور احساس کے ساتھ بے خبر سو جائے۔

اُس نے خود کو درست کیا، بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی، شارٹ کے بٹن بند کیے اور مسز ماتھر کے بیڈ روم سے نکل کر نیچے اُترنے لگا، تھکے تھکے قدموں سے اس کی پلکیں نیند سے بوجھل تھیں، رنگ اُڑا اُڑا سا تھا، ہونٹ خشک تھے لیکن خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، ایسی جیسے اُس نے مسز ماتھر کی زندگی کا سارا رس چوس لیا ہو ——!

اور آج پورے سات سال کے بعد مسز ماتھر کی ایک جھلک دیکھی تھی اور دو شیم سے نکلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ اگر مسٹر ماتھر یہیں ہیں تو کل شام ــ

اُسے انتظار نہیں کرنا پڑا، اِدھر کال بیل پہ انگلی رکھی اُدھر دروازہ کھُلا، اس نے پہلی ہی نظر میں مسٹر ماتھر کو پہچان لیا، مسٹر ماتھر ٹھٹکے تو وہ ایک قدم آگے بڑھا

”نہیں پہچانا مجھے؟“

اور جیسے مسٹر ماتھر کی آنکھوں کے سامنے تنا ہوا سات سال کی مدّت کا دبیز پردہ اچانک ہٹ گیا۔ وہ چونک پڑے۔

”امر بابو آپ“ اور وہ اُس کا ہاتھ تھام کر اندر لیتے چلے گئے، فرطِ مسرت سے آواز دی ”ابی دیکھو تو کون آیا ہے“

مسز ماتھر ڈرائنگ روم ہی میں تھیں، اُس پر نظر پڑتے ہی چونک گئیں، لیکن فوراً ہی خود کو سنبھال لیا، اور اُسے اِس طرح دیکھنے لگیں جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مسز ماتھر کو خاموش دیکھ کر مسٹر ماتھر نے کہا۔

”ارے یہ امر بابو ہیں، مظفر پور میں ہم ساتھ رہتے تھے۔“

”اوہ! بہت دنوں کے بعد دیکھا ہے نا، اِس لیے پہچان نہ سکی“ مسز ماتھر نے نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا۔

اُس نے محسوس کیا کہ مسز ماتھر جھوٹ بول رہی ہیں، حالانکہ انھوں نے اُسے

پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔

مسٹر ماتھر اُس سے باتیں کرنے لگے تو وہ ڈرائنگ۔روم سے چلی گئیں۔ وہ مسٹر ماتھر سے باتیں کرتا رہا اور مسز ماتھر کے بارے میں سوچتا رہا، کوئی فرق نہیں۔ وہی رنگ وہی روپ، وہی سب کچھ، لیکن —— تھوڑی دیر بعد مسز ماتھر چائے کی ٹرے سنبھالے واپس آئیں تو وہ تنہا نہ تھیں، اُس کی سوچ کا حاصل اُن کے ساتھ تھا، آنچل تھامے ہوئے۔ اُس نے بچے کو دیکھا اور دیکھتا رہا تو ماتھر بولے، یہ راجو ہے، میرا بیٹا، تمھارے مظفر پور سے چلے جانے کے بعد پیدا ہوا تھا، اس کا دل دھڑکنے لگا تھا، شریانوں میں خون اُبلتا ہوا محسوس ہونے لگا، اُس نے راجو کو خود سے قریب کر لیا تو اُس کے دل کی دھڑکنیں اور تیز ہو گئیں۔ مسز ماتھر چائے کی ٹرے رکھ کر جاتے ہوئے راجو کو بھی ساتھ لیتی گئیں، وہ چائے پیتا رہا، ماتھر سے باتیں کرتا رہا اور دروازے کی طرف دیکھتا رہا، لیکن مسز ماتھر پھر آئیں اور نہ اُن کا بچہ راجو،

ماتھر سے مل کر لوٹتے ہوئے وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اپنی کوئی کھوئی ہوئی چیز ماتھر کے یہاں پا کر بھی چھوڑے جا رہا ہو۔ اُسے مسز ماتھر کے رویے پر بھی حیرت تھی۔ اُن کے ملنے کے انداز میں اپنا پن نہ تھا، خلوص و مسرت نہ تھی۔ اجنبیت تھی، بے گانگی تھی، سرد مہری اور بے زاری تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا اب وہ ماتھر کے یہاں نہ جائے گا۔ اس لیے بھی کہ اگر وہ اپنے جذبات و احساسات پر قابو نہ پا سکا تو ہو سکتا ہے ایک بار پھر سب کچھ تباہ ہو جائے گا، ایک خوشگوار ماحول، ایک ہنستا مسکراتا گھر، ماتھر اور مسز ماتھر کی زندگی اور راجو ——!

لیکن ایک ہی ہفتہ بعد ——!

وہ اپنے کوارٹر کے دالان میں کسم کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ اُسے سامنے سے مسز ماتھر آتی ہوئی نظر آئیں، اُن کے ساتھ راجو بھی تھا، اُس نے کسم کی طرف دیکھا تو خوفزدہ ہو گیا، دل کی دھڑکنیں تیز ہوئیں تو اُسے اپنی پیشانی پر نمی کا احساس بھی ہونے لگا، اِس لیے کہ کسم کی نظریں بھی مسز ماتھر ہی کی طرف تھیں وہ پیش آنے والے

حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔

"کون ہیں یہ؟" کسم نے پوچھا

"نیشنل بینک کے برانچ مینجر مسٹر ماتھر میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ یہ انھیں کی وائف ہیں، رنجیتا جی!" اُس نے کسم کو تفصیل سے جواب دیا تاکہ کسی اور سوال کی گنجائش نہ رہے۔

اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس نے مسز ماتھر کا استقبال کیا اور کرسی پیش کرتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں رہتا ہوں؟"

مسز ماتھر نے شانہ سے ڈھلکے ہوئے آنچل کو درست کیا اور بولیں۔ "اُن کو آپ نے بتایا تھا، اور اُنھوں نے مجھے بتایا!" مسز ماتھر نے کسم کی طرف دیکھا تو اُس نے کہا۔

"یہ کسم ہیں میری بیتنی!"

دونوں نے ہاتھ جوڑ کر ایک دوسرے کو پرنام کیا۔ کسم بار بار راجو کو دیکھ رہی تھی جیسے اُسے راجو میں کوئی خاص بات نظر آ رہی ہو، وہ اپنی جگہ بیٹھا اضطرابی کیفیت میں مبتلا رہا اور مسز ماتھر سے باتیں بھی کرتا رہا۔ بہت محتاط، سنبھل سنبھل کر اُس نے محسوس کیا مسز ماتھر بھی کم محتاط نہیں ہیں۔ وہ حیرت زدہ بھی تھا کہ مسز ماتھر اُس سے ملنے کیوں آئیں جب کہ انھوں نے اپنے یہاں اس کے ساتھ اجنبیوں کا سا برتاؤ کیا تھا۔

جب مسز ماتھر جانے لگیں تو وہ بھی اخلاقاً کچھ دور تک انھیں چھوڑنے کے لیے ساتھ چلنے لگا، کمپاؤنڈ سے نکل کر اُس نے کہا۔

"حیرت ہے آپ میرے یہاں کیسے آئیں، اپنے یہاں تو آپ نے میرے ساتھ اجنبیوں کا سا برتاؤ کیا تھا۔"

مسز ماتھر تھوڑی دیر خاموش رہیں، پھر بولیں۔ "میں نے قصداً ایسا کیا تھا

اور ایسا کرنے کے لیے مجھے خود پر جبر کرنا پڑا تھا۔ کیا آپ میری مجبوریوں کو نہیں سمجھتے ؟ " مسز ماتھر نے راجو کو اور قریب کر لیا۔

"ٹھیک ہی کہتی ہیں آپ۔ مجھے آپ سے کوئی ایسی شکایت نہ ہونی چاہیے ! "
اُس نے اس طرح کہا جیسے پہلی بار اُسے مسز ماتھر کی مجبوریوں کا احساس ہوا ہو
اس نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔

"اب کیسی گزر رہی ہے ؟ "

مسز ماتھر مسکرانے لگیں، بولیں " بہت اچھی، جیسی میں چاہتی تھی، اب تو اُن کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں " وہ باتیں کرتے ہوئے چلڈرن پارک تک آ گئے
بہت سارے بچے پارک میں کھیل رہے تھے۔ وہ رُک کر بولا۔

"آئیے میں آپ کو اپنے بچوں سے ملاؤں ! " اور اُس نے اپنے بچوں کو آواز دی۔ — " رتن، گڈی ! "

دو خوبصورت خوبصورت بچے دوڑتے ہوئے آ گئے اور دائیں بائیں، اس سے لپٹ گئے۔ اس نے مسز ماتھر کو بچوں سے ملایا۔

" یہ رتن ہے، دس سال کا ہوا ہے، اور گڈی ہے قریب سات سال کی ہوئی ! "

مسز ماتھر کبھی رتن کو دیکھتی تھیں اور کبھی راجو کو۔ دونوں کے درمیان تقریباً چار سال کا فاصلہ تھا۔ وہ رتن اور راجو کو دیکھ رہی تھیں کہ اس نے کہا۔

" کسم بھی یہی محسوس کر رہی تھی جو آپ۔ کچھ سمجھا آپ نے ؟ "

" آں ... ہاں، مسز ماتھر جیسے خواب سے بیدار ہوئیں، اور پھر اُن کی نگاہیں پھول کی طرح شگفتہ گڈی پر مرکوز ہو گئیں۔ کہنے لگیں۔

" بہت پیاری بچی ہے، گڑیا جیسی، انھوں نے گڈی کو گود میں اُٹھا لیا، اُسے پیار کرتے ہوئے بولیں،

" کاش مجھے بھی ایسی ہی ایک بیٹی ہوتی، میں بھی اُسے اسی طرح سجاتی،

سنوارتی !،، اور وہ اس سے اِس طرح مخاطب ہوئیں جیسے اچانک کوئی اہم بات یاد آگئی ہو۔

،، تو آرہے ہیں نا آپ آج رات میرے یہاں ؟ ،،

،، کیوں، کوئی خاص بات ہے کیا ؟ ،، وہ مسز ماتھر کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

مسز ماتھر نے دُزدیدہ نظروں سے اُسے دیکھا، مُسکرائیں اور گڈی کے رخسار کو چوم کر بولیں۔

،، وہ باہر گئے ہیں تین چار دنوں بعد واپس آئیں گے !،،

اور اس نے محسوس کیا مسز ماتھر کا خوبصورت، پُرکشش، بے داغ چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا ہے۔ پلکیں بارِ حیا سے جُھک گئی ہیں، اور گڈی کے گرد ان کی باہوں کا حلقہ اور تنگ ہو گیا ہے !!!

★★★

اپنی منزل

آسمان رات بھر بادلوں سے ڈھکا رہا تھا، کبھی تیز اور کبھی ہلکی بارش ہوتی رہی تھی خنک ہوائیں چلتی رہی تھیں، دن بھر کی تپش کے بعد رات سرد ہو کر فرحت بخش ہو گئی تھی۔ سارا عالم محو خواب تھا، لیکن وہ جاگتی رہی تھی، کروٹیں بدلتی رہی تھی، جیسے دبیز و نرم بستر پر نہیں انگاروں پر سوئی ہو، عجیب عالم تھا اضطراب کا، کبھی دائیں کروٹ کبھی بائیں کروٹ، کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی تو کبھی پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو جاتی تھی، کبھی پیروں کو موڑ کر گھٹنوں میں چہرہ چھپا لیتی تھی تو کبھی پلنگ سے اتر کر ٹہلنے لگتی تھی اور کبھی سرد ہواؤں اور بارش کے چھینٹوں سے بے نیاز بالکونی میں کھڑے ہو کر مہیب تاریک سناٹے میں دور تک گھورنے لگتی تھی — اور جب اس کے اندر دور تک درد کی لہریں بکھر جاتی تھیں تو وہ اور زیادہ مضطرب ہو جاتی تھی۔ تب اس کا جی چاہنے لگتا تھا خود کو نوچ ڈالے اسی طرح جس طرح وہ باغ میں کھلے پھولوں کو شاخ سے جدا کر کے ان کی پنکھڑیاں بکھیر دیا کرتی ہے۔ وہ سوچنے لگتی تھی ابھی ہی انگلیاں اپنے سینے میں گاڑ کر بے ترتیب دھڑکتے ہوئے دل کا سارا لہو نچوڑ دے، بالکونی میں کھڑے ہو کر مہیب تاریک سناٹے میں گھورتے ہوئے اس کا دل چاہنے لگتا تھا۔ اس تین منزلہ سے چھلانگ لگا دے تا کہ کرب کے سمندر میں ڈوبتا ابھرتا اس کا وجود مہیب تاریکی میں گم ہو جائے اور جب سوچتے سوچتے دماغ کی رگیں پھٹنے لگتی تھیں تو اس کا جی چاہتے لگتا تھا کہ یہ سر کسی دیوار پر اتنا زور سے مارے

کہ سوچ کا شیرازہ منتشر ہو جائے! لیکن سوچ کے اِس عالم میں بھی یہ سوچنے کی صلاحیت باقی تھی کہ اس سے ہوگا کیا؟ — اسی کرب و اضطراب کے عالم میں گزرتے ہوئے رات گزر گئی تھی، لیکن سوچ کا سلسلہ دراز ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

صبح خوشگوار تھی، آسمان پر تنی ہوئی بادلوں کی سُرمئی چادر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی تھی، ہواؤں نے سبک روی کا جانگداز انداز اختیار کر لیا تھا۔ رات بھر کی بارش میں ہر چیز دُھل کر نکھر گئی تھی، ہر طرف شادابی تھی، ہر سمت تازگی تھی، لیکن اُس کے اندر اور باہر شادابی تھی نہ تازگی، وہ بالکونی کے ایک کنارے دیوار سے ٹیک لگائے گم سُم کھڑی تھی۔ سامنے اُس کا اپنا پائیں باغ تھا، سرسبز و شاداب، سرو، بام اور یوکلپٹس کے سائے میں سُرخ اور سفید نیلے اور پیلے پھولوں سے لدی ڈالیاں سبک رَو ہواؤں کی تال پر جھوم رہی تھیں۔ فضا میں ہر سمت خوشبوئیں تیر رہی تھیں۔

سبزہ زاروں پر گوریوں کا چہچہانا، چہلیں کرنا، اٹھکھیلیاں کرنا، اپنی اپنی چونچوں سے ایک دوسرے کو چھیڑنا، گُدگُدانا، اسے ذرا نہ بھایا۔ وہ ان پرندوں کے باہمی ربط اور محبت کے انداز سے خوب واقف تھی، اس کی نگاہیں گوریوں پر مرکوز تھیں کہ عمارت کی پُشت پر بنے کابک سے اڑ کر کبوتروں کا غول باغ میں بکھر گیا۔ کچھ درختوں پر، کچھ سبزہ زاروں پر ایک جوڑا اُس سے کچھ فاصلہ پر بالکونی کی ریلنگ پر آکر بیٹھ گیا۔ کبوتری سفید تھی، کبوتر سیاہ، گُٹر گوں گُٹر گوں کی آواز کے ساتھ دونوں کی چونچیں آپس میں ٹکرانے لگیں، دونوں ایک دوسرے کو چھیڑنے لگے تھرکنے لگے، ان کے پیار کے درمیان سفید اور سیاہ کا امتیاز نہ تھا۔ اُسے یاد آیا ایک شام وہ آواز دیے بغیر زرینہ کے کمرے میں جا گھُسی تھی۔ اُسے دیکھ کر زرینہ اور خیام گھبرا کر الگ الگ ہو گئے تھے —— اُس کی ذہنی رو بہک گئی آہستہ سے جھکی، پاؤں سے نکال کر چپل ہاتھ میں لیا، سیدھی ہوئی اور چپل کبوتروں پر دے مارا۔ کبوتروں کا جوڑا پھڑ پھڑا کر اُڑ گیا۔ دونوں دو طرف بٹ گئے، باغ کا ایک چکر لگا کر بام پر بیٹھ گئے، ایک دوسرے کے قریب بہت ہی قریب اور پھر

وہی عمل ۔ وہی تکمیں ، پیار کا ، چاہت کا۔ وہ جھنجلا گئی۔ کمرے میں آ کر بالکونی میں کھلنے والا دروازہ جھٹکے سے بند کر دیا ، کمرے سے باہر راہداری میں آئی تو اُس کی نظر ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لیے آتی ہوئی زرینہ پر پڑی ، زرینہ نے اُسے دیکھا اور مُسکرا دی ، زرینہ کی مُسکراہٹ نے اس کے اندر چنگاریاں سی بھر دیں۔ وہ تڑپ اُٹھی ۔ جی چاہا سامنے سے گزرتی ہوئی زرینہ کی کمر پر ایک لات جڑ دے تاکہ وہ ٹرے لیے ہوئے اوندھے منہ گر پڑے لیکن وہ ایسا نہ کر سکی ، آنکھوں میں دنیا بھر کی نفرتوں کو سمیٹے زرینہ کو فیاض کے لیے بیڈ ٹی لے جاتے دیکھتی رہی ، نفرت سے سکوڑے ہونٹ متحرک ہوئے ، "خوشامدی ۔۔ بے وقوف ۔۔ سگڑ ۔"

اُسے زرینہ سے دو دن پہلے کہی ہوئی اپنی بات یاد آئی۔ زرینہ کو فیاض کے لیے رات کا کھانا اوپر لے جاتے دیکھ کر اس نے کہا تھا ۔ "گھر میں نوکر ہیں ، نوکرانیاں ہیں۔ اُن سے کام لو ، یہ کیا کہ صبح کی بیڈ ٹی سے رات کا کھانا تک تم ہی لے جاتی ہو فیاض کے لیے !"

اور زرینہ نے مُسکراتے ہوئے ، شرماتے ہوئے کہا تھا ۔ "جو کام میرے کرنے کا ہے وہ کوئی اور کیوں کرے ۔"

زرینہ کے جواب نے اُس کی انا پر بھر پور وار کیا تھا ۔ تلملا گئی تھی ۔

وہ تیجے جاتے جاتے پھر کمرے میں لوٹ آئی ۔ اِس طرح کمرے کا جائزہ لینے لگی جیسے عرصہ کے بعد اپنے کمرے میں آئی ہو۔ بستر کی شکنیں کرب و اضطراب میں گزری اُس کی پوری رات کی داستان بیان کر رہی تھیں ، ہینگروں پر بے ترتیب ٹنگے ہوئے ملبوسات اس کی ذہنی اُلجھنوں کا اعلان کر رہے تھے ۔ بک سلف اور میز پر بکھری کتابیں اُس کے چڑچڑے پن کا گلہ کر رہی تھیں ، ڈریسنگ ٹیبل پر منتشر مصنوعات کی شیشیاں اپنی طرف سے اُس کی بے توجہی کا ماتم کر رہی تھیں اس کے عکس سے محروم آئینہ اپنی تنہائی پر اس کی ذات سے شکوہ سنج تھا۔ کمرے کے اُجڑے اُجڑے ماحول نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اُسے سب کچھ اجنبی

اجنبی سا محسوس ہوا۔ وہ لرز گئی۔ ڈرتے ڈرتے آئینہ کے سامنے آئی اور تب اُسے محسوس ہوا وہ خود بھی اُجڑ گئی ہے۔ بکھرے ہوئے بال، متورم پپوٹوں کے نیچے بُجھی بُجھی سی آنکھیں، مرجھائے ہوئے رخسار، پژمردہ ہونٹ، نہ کہیں شگفتگی نہ کہیں تازگی . . . . جیسے سب کچھ لٹ گیا ہو، لُٹتا جا رہا ہو — وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئی — طویل راہداری کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک دیکھا۔ خود کو تنہا پایا تو احساس ہوا، جیسے لق و دق۔ بے آب و گیاہ صحرا میں کھڑی ہو۔ نہ کوئی چھاؤں، نہ کوئی ہمسفر — اُسے محسوس ہونے لگا جیسے بہت دور سے کوئی اُسے آواز دے رہا ہو۔ پروین — پروین — پروین —!
اُس کے قدم ڈگمگائے تو اُس نے دیوار کا سہارا لے لیا۔ آنکھیں بند کیں تو ذہن کی آنکھیں روشن ہونے لگیں۔ ایک دُھند چھٹنے لگی۔ ایک شبیہہ اُبھرنے لگی ایک آواز سماعت سے ٹکرانے لگی۔ مجھے غلط مت سمجھو — میں تمھارا ہوں — لیکن — اوروں کا بھی تو حق ہے مجھ پر — میرے فرائض — میری ذمہ داریاں — اور تمھاری ذمہ داریاں بھی تو کم نہیں ہیں —! لوٹ آؤ — واپس آجاؤ پروین، — اپنی دنیا میں —! — اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں — سہمی سہمی نظروں سے اپنے گرد دیکھا، اور پھر اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

وہ پاؤں لٹکائے پلنگ پر بیٹھی خیالوں کے گھنے جنگل میں بھٹک رہی تھی دروازوں اور کھڑکیوں پر تنے پردے ہل رہے تھے۔ اس نے ہتھیلیوں کے کٹورے میں چہرہ چھپا لیا۔ معاً اُسے محسوس ہونے لگا، ذہن پر تنا ہوا دو سالہ مدت کا دبیز پردہ ایک طرف سرک رہا ہے۔ اور — اور پھر وہی شبیہہ — وہی مانوس مانوس سا نرم لہجہ — حق دار تم سے اپنا حق مانگتے ہیں، کیا بُرا کرتے ہیں؟ ماں وہی تو چاہتی ہے تم سے جو اُسے چاہنا چاہیے۔ — میرے بھائی بہن وہی تو پانا چاہتے ہیں تم سے جو انھیں پانا چاہیے! اور تم — خود کو صرف مجھ تک — مجھے وہ۔۔ اپنے آپ تک محدود رکھنا چاہتی ہو — ادھر اُدھر جا آتی ہو

سے بُرے ماحول سے ۔ اپنی ذمہ داریوں سے ۔ اپنے فرائض سے ۔!
وہ پلنگ پر جست کرتے ہوئے چیخ پڑی۔ ہاں، میں فرار چاہتی ہوں اس جہنم سے،
زرینہ کے جھنجھوڑنے پر اُس نے آنکھیں کھول دیں، ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ زرینہ
کے ساتھ فیاض بھی تھا۔
طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ کیوں چلائیں تھیں آپ؟ زرینہ کا لہجہ پُرتشویش
تھا۔
وہ سنبھلنے اور مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ وہ بڑا ہی بھیانک
خواب تھا۔ دیکھ رہی تھی خطرناک جنگل میں گھر گئی ہوں۔ ہر سمت سے خونخوار درندے
منہ پھاڑے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور مارے خوف کے میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"
فیاض مُسکرانے لگا۔ زرینہ ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے بولی۔ "خوابوں کی تعبیریں
تو اُلٹی ہوتی ہیں۔"
اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔ جیسے زرینہ کہنا چاہتی ہو۔ خطرناک جنگل کا مطلب
ہنستا مُسکراتا گھر۔ اور خونخوار درندے شفیق و مہربان گھر والے ۔۔۔ اُس نے سر
جُھکا لیا۔ خاموش رہی۔
جھکی ہوئی نظریں اُٹھیں تو اُسے فیاض کے شانہ بہ شانہ جاتی ہوئی زرینہ مکمل
عورت نظر آئی۔ اور ۔۔ خود کو جب دیکھا تو ادھورے پن کا احساس ہوا۔
سوچنے لگی۔ اپنا نصف کہاں کھو آئی ہے ۔۔ کہاں؟
بے چینی بڑھی تو ٹہلنے لگی، اُسے محسوس ہونے لگا۔ بڑھنے والا ہر قدم اُسے
آگے نہیں پیچھے لیے جا رہا ہو۔ بہت پیچھے۔ اُس ماضی کی طرف جو دو سال پیچھے
چھوٹ گیا تھا۔ اُسے ماضی اور حال کے درمیان دو سال کا فاصلہ محسوس ہونے
لگا، اُس کے قدم سست ہونے لگے۔ جیسے صدیوں کا فاصلہ تہلطے کرتے کرتے
تھک گئی ہو۔ تھک کر نڈھال ہو گئی ہو
شاور سے ٹھنڈا پانی برس رہا تھا۔ دیر تک نہانے کے بعد اُسے اپنے

اندر کی بے چینی میں بہت کمی محسوس ہوئی تو تازہ دم اور پُرسکون ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ باتھ روم سے نکلی تو زرینہ کو ناشتہ کی ٹرے لیے اوپر جاتے دیکھا۔ اُسے اپنی پڑوسن پاروتی یاد آ گئی، جو ہر صبح پوجا کی تھال سجائے شیو کے مندر جایا کرتی ہے۔ —— بہت کچھ کھو کر کچھ نہ پانے کے احساس نے چٹکی لی تو دو چار قدم لڑکھڑائی۔ پھر سنبھل گئی۔

کچھ دیر تک وہ کشادہ گھر میں چکر لگاتی رہی۔ کبھی اوپر، کبھی نیچے، کبھی اس کمرے میں کبھی اُس کمرے میں۔ جیسے تلاش کر رہی ہو کوئی ایسی چیز جس کا نام بھول گئی ہو۔ —— اور پھر ڈرائنگ روم میں آ کر صوفہ پر بیٹھ گئی۔ سامنے چھوٹی میز پر نوشگفتہ پھولوں کے گلدان کے ساتھ اخبارات و رسائل رکھے تھے۔ اور کچھ فاصلے پر ٹیلی فون —— اُس نے ایسی نظروں سے ٹیلی فون کو دیکھا، جیسے پہلے کبھی ٹیلی فون نہ دیکھا ہو۔ اُسے اپنے اندر کچھ ٹوٹتا اور بکھرتا سا محسوس ہونے لگا تو آگے جھکی۔ ایک رسالہ اٹھا کر اوراق اُلٹنے پلٹنے لگی۔ لیکن اس کی نگاہیں بار بار رسالے کے اوراق سے پھسل پھسل کر ٹیلی فون کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ ——

آفتاب غروب ہو چکا تھا، وہ اپنے کمرے میں ہینگروں پر بے ترتیب ٹنگے ہوئے ملبوسات کو، بک سیلف اور میز پر بکھری کتابوں کو، ڈریسنگ ٹیبل پر منتشر مصنوعات کی شیشیوں کو قرینے سے سجا کر بستر کی شکن آلود چادر اور تکیوں کے غلافوں کو بدلنے لگی اور جب اپنے تکیہ کے برابر دوسرا تکیہ رکھا تو اُس کے ہونٹوں پر خود بخود مُسکراہٹ بکھر گئی۔ رخساروں پر حیا کی سُرخی چھا گئی قدموں کی آہٹ ہوئی تو اس نے دیکھا۔ زرینہ کمرے میں کھڑی بدلے ہوئے ماحول کو دیکھ رہی تھی۔

اُس سے اس تبدیلی کا سبب پوچھے بغیر زرینہ نے کہا۔

"آپا! کل صبح میں چلی جاؤں گی!"

"کیوں؟" وہ زرینہ کے قریب آ گئی۔

"اُن کی مرضی!" زرینہ نے سر جھکالیا۔

وہ زرینہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر محبت آمیز لہجے میں بولی۔ "ابھی نہیں، دو چار دنوں بعد، تم اپنے گھر چلی جانا اور — میں اپنے گھر!"

"اپنے گھر!" زرینہ کے لہجے میں حیرت تھی، بے انتہا۔

"ہاں، وہ — وہ آرہے ہیں نا، تیرے دولہا بھائی!" اُس کی نگاہیں جھک گئیں۔

"لیکن — کیسے معلوم ہوا آپ کو؟ دولہا بھائی آرہے ہیں" زرینہ کی حیرت میں اور اضافہ ہوگیا۔

وہ جھجکتے ہوئے — شرماتے ہوئے، — زرینہ کی طرف سے مڑتی ہوئی بولی۔ "صبح میں نے فون کیا تھا!" اور وہ اس طرح کمرے سے باہر نکلی جیسے کوئی عالم سرور میں میکدہ سے نکلے۔

زرینہ عالم استعجاب میں کھڑی اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی آپا نے اپنی کھوئی ہوئی منزل کا پتہ پالیا ہے، اور اب سیدھے راستے پر گامزن ہیں اپنی منزل کی طرف!!!

★★★

اب خفا ہے وہ نگاہ

یونیورسٹی لان سے گزرتے ہوئے رتن کو دیکھا جو مجھ سے کچھ فاصلے پر گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ چکن کی سفید ساڑی اور بلاؤز، پشت پر بکھری ہوئی ادھ کھلی، دراز زلفیں، اور چلنے کا انداز ایسا جیسے اُس کے خوبصورت وجود کا بوجھ زمین نہیں ہوائیں سنبھال رہی ہوں۔ میں اس کی طرف تیز تیز قدم بڑھانے لگا۔

”مس رتن!“

”جی!“ وہ پلٹی مجھے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

”آپ کو دیکھا تو خیال آیا۔ آپ کے بڑے بھائی مسٹر اشوک نے کہا تھا آپ کے لیے ایک اچھے ٹیوٹر کا بندوبست کر دوں جو آپ کو انگریزی پڑھا سکے“

”تو کر دیا بندوبست آپ نے؟“ وہ نظریں جُھکائے ہوئے ہی بولی۔

”نہیں اب تک کوئی بھروسے کا نہیں مل سکا ہے۔ لیکن آپ ان سے کہیے گا میں ایک دو دن میں کسی معقول ٹیوٹر کا بندوبست کر دوں گا!“

”میں جانتی ہوں آپ بھی ٹیوشن کرتے ہیں، کیا آپ ہی میرے لیے تھوڑا وقت نہیں نکال سکتے؟“ اُس نے ایک پل کے لیے مجھے دیکھا اور نظریں جُھکا لیں۔

اُس وقت تو میں نے رتن کو کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن بعد میں سوچا، بے کاری کے اِن جاں گُسل دنوں میں تو میں ٹیوشن ہی سے اپنی ضرورتیں بڑی مشکل سے پوری کر رہا ہوں اگر رتن کو پڑھانے لگوں تو ہر ماہ ساٹھ روپے تو مل ہی جائیں گے۔

دوسرے ہی دن سے میں رتن کو پڑھانے اس کے گھر جانے لگا۔ ــــ شام کے سات بجے سے نو بجے تک کا یہ وقت میرے لیے بڑا ہی ضبط آزما تھا۔ اپنی ذمہ داریوں کا احساس۔ رتن کو پڑھانا، اس کا قرب، اس کا سنجیدہ لیکن سحر انگیز حسن، ہم دونوں کے علاوہ کسی اور کا موجود نہ ہونا اور ــــ اور رتن کے لیے میرے دل میں دھیمی دھیمی سلگتی ہوئی آنچ۔

رفتہ رفتہ میں شدت سے یہ محسوس کرنے لگا کہ رتن بھی مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے اور میں بھی یہ چاہنے لگا ہوں کہ رتن سے اپنے دل کی بات کہہ دوں اور وہ بھی وہ سب کچھ کہہ دے جو میں صرف محسوس کرتا ہوں، ایک دن رتن کو ٹٹولنے کی غرض سے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میں نے کہا۔

"تم جانتی ہو میں کہانیاں بھی لکھتا ہوں۔ اب تک میں اپنی کہانیوں کے کرداروں کے احساسات وجذبات کی ترجمانی اپنے ہی احساسات وجذبات کے سہارے کرتا آیا ہوں۔ لیکن چاہتا ہوں اپنے کرداروں کے احساسات وجذبات کی حقیقی تصویر پیش کروں۔ کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکو گی۔"

"وہ کیسے؟" وہ میری طرف غور سے دیکھنے لگی۔

"میرے سوالوں کا جواب دے کر" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی سے کہے 'میں تمھیں پیار کرتا ہوں'، تو وہ لڑکی کیا کہے گی؟"

"کسی اور کے دل کی بات میں کیا جانوں۔" اس نے سر جھکا لیا اور آہستگی سے بولی۔

میرا سوال مہمل تھا اور مجھے رتن سے اسی جواب کی توقع تھی۔ میں نے کہا۔

"اگر کوئی تم سے ہی یہ کہے تو؟"

"لیکن کوئی مجھ سے یہ کہے گا کیوں؟"

"دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر!"

تو کیا میں ایسی ہی ہوں کہ جس کا جی چاہے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھ سے یہ کہہ بیٹھے!"

میں خاموش رہا جیسے بات کو آگے بڑھانا اب میرے بس میں نہ ہو، مجھے خاموش دیکھ کر وہ خود کہنے لگی۔

"میں تو اس کا جواب اسی وقت دے سکتی ہوں جب کہ سوال کرنے والا اپنی [illegible] اور واضح شخصیت کے ساتھ میرے سامنے موجود ہو تاکہ میں یہ دیکھ سکوں کہ وہ یہ بات کہنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں۔ اب بتایئے وہ کون ہو سکتا ہے جو مجھ سے یہ بات کہہ سکے؟" وہ مسکرانے لگی۔

میں تذبذب میں پڑ گیا۔ رتنا نے مجھے اس مقام پر لا کھڑا کر دیا تھا۔ جہاں میں خود کو بے نقاب کر دینے پر مجبور پا رہا تھا۔ میں نے سینے میں اچھلتے ہوئے دل کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"فرض کر لو اگر میں ہی یہ بات کہوں تو؟"

"تو پھر کہیے!" ہونٹوں کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی مسکرانے لگیں۔

میں سمجھ گیا۔ رتن چاہتی ہے کہ میں براہ راست یہ بات اس سے کہوں۔ میں نے ہمت کر کے اس سے کہا۔

"رتن! میں تمھیں پیار کرتا ہوں" اور میں اپنی اس بات کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے اسے دیکھنے لگا۔

اس کے چہرے پر سنجیدگی کے نقوش اتنے گہرے ہو گئے کہ میں سراسیمہ ہو گیا، اور پھر اس کی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں کے قطروں کو دیکھ کر میں بے چین ہو گیا۔ اور سوچنے لگا، رتن سے یہ بات مجھے نہیں کہنی چاہیے تھی۔ کہاں میں اور کہاں رتن۔ میں اپنی اوقات بھول گیا تھا۔ — میرا سر ندامت سے جھک گیا — اور پھر کئی دنوں تک میں رتن کے گھر نہ گیا۔ ایک دن اس کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا — اگر آپ مجھے پڑھانا نہیں چاہتے تو میں آپ

کو مجبور نہ کروں گی۔ لیکن اپنی بات کا جواب سننے کے لیے تو تھوڑی دیر کے لیے آ جانا چاہیے!"

اسی شام میں رتن کے گھر گیا۔ اس وقت وہ میرے پسندیدہ لباس میں تھی۔ سفید باڈر کے بلیو رنگ کی ساڑی اور اسی سے میچ کرتے ہوئے بلاؤز میں اس کا کھلتا ہوا رنگ و روپ اور نکھر آیا تھا۔

"کیسی لگتی ہوں ان کپڑوں میں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

میں حیران ہو گیا، جیسے رتن کا یہ سوال غیر متوقع ہو۔ پھر بھی میں نے کہا۔

"اچھی لگتی ہو!"

"صرف اچھی" وہ سر کو ذرا سا جھٹک کر بولی۔

"بہت اچھی!" میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر دیکھیے میری طرف!"

رتن پے در پے میرے ذہن کو جھٹکے لگا رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"کیا کروں گا دیکھ کر؟"

"پھر وہی سوال!" اس کی آنکھوں کی چمک میں اور اضافہ ہو گیا۔

"نہیں، میں پھر وہ سوال کر کے تمھیں غمزدہ اور خود شرمسار ہونا نہیں چاہتا۔" میرا لہجہ اُداس تھا۔

"تو مجھی سے جواب سن لیجیے!"

مجھے خاموش دیکھ کر وہ کہنے لگی۔

"اگر یہ سچ ہے کہ آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں، تو میں کہوں گی آپ کا پیار میری زندگی ہے۔!"

"رتن! تم مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟" میں حیرت زدہ ہو گیا۔

"نہیں! میں سنجیدہ ہوں!"

"تو پھر تمھارے

وہ تھوڑے توقف سے بولی۔ "جب پہلی بار معلوم ہوا کہ کوئی مجھ سے پیار کرتا ہے تو میں ضبط نہ کر سکی۔ جذبات کی شدت سے آنکھیں چھلک پڑیں۔ آپ سمجھتے ہیں میں اس گھر میں خوش ہوں، نہیں۔ اس گھر میں سونے چاندی اور دولت کی فراوانی تو ہے لیکن پیار نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہاں پر ہر چیز دولت کے ترازو میں تولی جاتی ہے، باپ کی شفقت، ماں کی ممتا۔ بھائی بہنوں کا پیار۔ سب کچھ میں ترستی رہی ہوں سچی خوشی کے لیے، پیار کے دو میٹھے بول کے لیے اور جب معلوم ہوا آپ........" اس کی آنکھیں بھر آئیں آواز گلوگیر ہوگئی۔ "مجھے دولت نہیں پیار چاہیے پیار صرف پیار۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم نہ تھا تم اندر سے اتنی غمزدہ ہو، اداس ہو۔ یقین کرو میں کبھی مایوس نہ کروں گا!"

رتن میری ہے، اس کی آنکھوں کی خیرہ کن چمک، ساون کی کالی گھٹاؤں کی طرح ہمہ وقت ادھ کھلی دراز زلفیں، شفق گوں عارض۔ شبنمی ہونٹ اور ان پر چٹکتی ہوئی گلاب کی کلیاں، سب میری ہیں۔ یہ خیال ہی میرے لیے انتہائی حیات آفریں و مسرت انگیز تھا۔

ایک دن ——

رتن امتیازی حیثیت سے بی۔ اے۔ پاس کر گئی تو میں مبارکباد دینے اس کے گھر گیا۔

"مبارک ہو رتن! تمھیں تمھاری محنتوں کا ثمر مل گیا۔ تم کامیاب ہوگئیں۔ میری آواز میرے اندر کی خوشی کو ظاہر کر رہی تھی۔ لیکن یہ دیکھ کر میں حیران ہوگیا کہ اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک کے بجائے آنسو جھلملا رہے تھے۔

"تم رو رہی ہو رتن! کیا یہ خوشی کے آنسو ہیں؟"

"نہیں، یہ میرے دل کا کرب ہے جو آنسو بن کر چھلک پڑا ہے!" اس کی

آواز میں بلا کا سوز تھا۔

"کرب، کیسا کرب؟ کیا تکلیف ہے تمھیں؟" میں اور بے قرار ہو گیا۔

"اپنے پاس ہو جانے کی خوش کن خبر کے ساتھ آج ہی میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ اب میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکوں گی۔ اپنے خاندان کی لڑکیوں میں سب سے زیادہ تعلیم حاصل کر چکی ہوں نا اس لیے، اور یہ بھی سُنا کہ اب میری شادی بھی جلد ہی کر دی جائے گی!" اس کی پلکوں پر ٹھہرے ہوئے آنسو رُخساروں پر ڈھلک گئے۔

میرے دل کو دھچکا لگا۔ پھر بھی خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"رتن! پیار مصری کی ڈلی نہیں زہر کا گھونٹ بھی ہے۔ یہ صرف پھولوں کی سیج نہیں تپتا ہوا ریگ زار بھی ہے۔ پیار کرنے والے زمانے کی ستم ظریفیوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ جسموں کے جدا ہونے سے پیار جدا نہیں ہوتا، یہ تو ایک رشتہ ہے ابدی، کبھی نہ ٹوٹنے والا!"

"آپ کی یہ باتیں مجھے تسلی نہ دے سکیں گی۔ آپ سے دور رہ کر میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔ آپ کی نہ ہو کر کسی اور کی بھی نہ ہو سکوں گی۔"

"پیار کی راہ پر چلتے ہوئے پہلی ہی ٹھوکر سے نڈھال ہو گئیں۔ حوصلہ رکھو۔ ہو سکتا ہے وہ سب کچھ نہ ہو جو تم سوچتی ہو۔ ہو سکتا ہے وقت ہمارا امتحان لے رہا ہو" میں نے اپنی اندرونی کربناک کیفیت کو چھپاتے ہوئے رتن کو مزید تسلی دینے کی کوشش کی۔

"آپ میرے گھر والوں کو نہیں جانتے۔ ان کی آنکھوں پر چڑھا ہوا دولت کا نشہ ہم دونوں کا ملن دیکھ کر رہ نہیں سکتا۔ وہ ہم دونوں کے ایک ہو جانے کی بات سوچ نہیں سکتے۔ وہ کبھی نہ چاہیں گے کہ میں کسی ایسے گھر میں جاؤں جہاں دولت کی پوجا نہ ہوتی ہو۔ اونچی عمارت نہ ہو، جہاں بزنس کے نام پر بلیک مارکیٹنگ اور لوٹ مار کا کاروبار نہ ہوتا ہو ___ دولت کی یہ بھٹی مجھے جلا کر راکھ کر دے گی مجھے بچا لیجیے، کچھ سوچیے، کچھ کیجیے!"

میں مضطرب تھا۔ رتن سے بچھڑ جانے کا تصور ہی میرے لیے انتہائی اذیت ناک تھا۔ جذبات و خیالات کی اٹھتی ہوئی بیکراں موجیں چاہے جیسے ہو رتن کو پانے پر آمادہ کر رہی تھیں۔ رتن کے ساتھ مسرتوں سے بھرپور زندگی گزارنے کا خیال مجھے زمانے سے بغاوت پر اکسا رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا خواہ کسی بڑی طاقت سے ٹکرانا ہی کیوں نہ پڑے۔ جبر و جور کا نشانہ کیوں نہ بننا پڑے، ایک رشتے کے لیے بہت سارے رشتوں کو کیوں نہ توڑنا پڑے۔ میں رتن کو حاصل کروں گا! اُسے لے کر کہیں چلا جاؤں گا، دور، بہت دور! اور جب اپنے اس فیصلے سے باخبر کرنے کے لیے رتن کو خط لکھنے بیٹھا تو محسوس ہوا، میرے اندر کوئی چھپا بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے، اس فیصلے میں عقل و ہوش اور دور اندیشی کا کہیں بھی پتہ نہیں۔ جذبات کا یہ سیل رواں کہیں تمہاری اور تمہارے ساتھ رتن کی زندگی کو اس طرف نہ دھکیل دے جہاں تباہی و بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے۔ تمہارے اس فیصلے میں صرف ہوس و خود غرضی، رتن کی خوبصورتی، اُس کے جوان جسم کے دلکش خد و خال کے تصور کو دخل ہے۔ ـــ پیار ہوس و خود غرضی نہیں ایثار و قربانی سکھاتا ہے ایک بار پھر سوچو! جذبات سے ہٹ کر، رتن کے خوبصورت تصور سے الگ ہو کر۔ کسی بھی فیصلے کے لیے خرد شرط ہے۔! ـــ قلم میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نڈھال ہو گیا۔ اور پھر بہت مشکل سے خود کو سنبھال کر ایک بار پھر سوچنے لگا ـــ اور تب مجھے محسوس ہوا رتن کو پا لینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے! میں حالات کی سنگینی کا مقابلہ نہ کر سکوں گا۔ اپنی حد سے بڑھی ہوئی ذمہ داریوں سے منہ نہ موڑ سکوں گا۔ اپنی زندگی سے وابستہ نصف درجن چھوٹے بڑوں کے اچھے مستقبل کی تلاش سے خود کو الگ نہ کر سکوں گا۔ ـــ اور اگر اپنوں سے بغاوت پر آمادہ ہو کر رتن میرے پاس آ بھی گئی تو میں اُسے خوش نہ رکھ سکوں گا۔ وہ میری غموں سے بھری زندگی کی تلخیوں کو گوارا نہ کر سکے گی۔ دولت اور امارت کے زیر سایہ پروان پڑھی رتن میرے غربت بھرے ماحول سے سمجھوتہ نہ کر سکے گی ـــ رتن ناسمجھ ہے

— نادان ہے۔ جذباتی ہے۔ جب جذبات کا چڑھتا دریا اتر جائے گا حسن و دولت کی لذتوں میں غربت و افلاس کا زہر گھلنے لگے گا تو — ؟ اور بہت سوچنے، اور سمجھنے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں رتن کی زندگی سے دور نکل جاؤں گا۔ اُس پر غموں کی تیز آنچ نہ پڑنے دوں گا، اُسے غربت اور افلاس کی صعوبتوں سے آشنا نہ ہونے دوں گا!"

انہیں دنوں مجھے ایک ایسی نوکری مل گئی جو میرے لیے ایک معجزہ سے کم نہ تھی اور اس نوکری نے مجھے رتن سے دور کر دیا۔

افسر کی کرسی پر بیٹھنے کے فوراً ہی بعد مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ اگر میں چاہوں تو ہر ماہ معقول تنخواہ کے علاوہ ہر روز ہونے والی اوپر کی اچھی خاصی آمدنی میرے جسم پر جمے افلاس کے زنگ کو کھرچ کر خوشحالی و فارغ البالی کی دبیز تہہ جما دے گی۔ میں حالات کی چکی میں اس قدر پِسا تھا کہ اب مزید ضبط کی تاب نہ تھی۔ اور جب دولت سسکتی بلکتی زندگی کا مداوا بن کر سامنے آ کھڑی ہوئی تو انسانیت اور انسانیت کے آدرشوں پر حصولِ زر کی طلب غالب آگئی۔ اور میں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیا۔

— تین سال بعد —

خود ہی اپنا جائزہ لیا تو معلوم ہوا اب میں وہ نہیں ہوں جو تین سال پہلے تھا اب کیا کچھ نہیں ہے میرے پاس! آرام دہ زندگی گزارنے کے سارے لوازمات نئی عمارت، نئی فیاٹ کار، اور لاکھ سے کچھ زیادہ ہی کیش — لیکن ان تین برسوں میں ہزار کوششوں کے باوجود میں رتن کو نہ بھلا سکا تھا۔ جب بھی اس کی یاد آتی اس کے ساتھ گزرے پُر مسرت دنوں اور لمحوں کا تصور مجھے تڑپا تڑپا دیتا۔

اور آج اچانک رتن سے ملاقات ہو گئی تھی۔ اُس کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں اور لمحوں کا تصور شدت سے جاگ پڑا تھا۔

بارکیٹ روڈ کے ہنگاموں سے کچھ ذرا آگے بڑھا تھا کہ میری نظر سامنے جاتی،

ہوئی عورت پر پڑی۔ ادھ کھلی دراز زلفیں، چلنے کا انداز دیا جیسے اس کا بوجھ زمین نہیں ہوا میں سنبھال رہی ہوں، میرا دایاں پیر اکسیلیٹر سے کھسل کر بریک پر آ گیا۔ کار رک گئی۔ میں نے آواز دی۔

"رتن!"

وہ پلٹی اور مجھ پر نظر پڑتے ہی چونک گئی۔ میں رتن کو زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں دنیا کی ساری اداسیاں سمٹ آئی ہوں۔ شگفتہ چہرے پر حزن و ملال کی تہیں جمی ہوئی تھیں، عارضوں پر زرد پھیلی کرنوں کا عکس دھندلا گیا تھا۔ ہونٹوں کی کلیاں مرجھا گئی تھیں۔ میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔

"اچھی تو ہو؟"

"میں ....؟" وہ خاموش ہو گئی اور مجھے اور میری کار کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ تو اچھے ہیں؟"

"میں ..... میں ..... میں .. مجھے محسوس ہوا کوئی غیر مرئی قوت میرا گلا دبا رہی ہو۔ آواز حلق ہی میں دم توڑ گئی۔

"تین سال بعد نظر آ رہے ہیں کہاں رہے اتنے دنوں؟"

میں نے اپنی ساری قوت اور حواس مجتمع کر کے اس کی طرف دیکھا اور پھر محسوس ہوا جیسے میرے اندر کوئی شے ٹوٹ کر ہر طرف بکھر گئی ہو — نہ ماتھے پر بندیا نہ مانگ میں سیندور — تو کیا — اور غیر ارادی طور پر میرے ہونٹوں سے ابل پڑا۔

"اب تک تمھاری شادی نہیں ہوئی رتن؟"

"شادی .....!" اس نے مجھے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر غیر مانوس مسکراہٹ پھیل گئی جس میں شہد کی سی مٹھاس نہیں۔ تلخی تھی۔ نشتر تھے زہر میں بجھے ہوئے۔ میں تلملا گیا۔ اس نے کہا۔

"پیار کا جو زہر پیا تھا، ابھی تو اُس کی تلخی ہی باقی ہے۔ پیار کی گھنی چھاؤں کی جستجو میں تپتے ہوئے ریگ زار کا سفر ہی ابھی ختم نہ ہوا۔"

"مجھے معاف کر دو رتن! میرے حالات میرا ساتھ نہ دے سکے۔ میں مجبور تھا لیکن اب میں مجبور نہیں ہوں۔ اب میں وہ نہیں جو تین سال پہلے۔ اب میں سب کچھ کر سکتا ہوں، حالات اور زمانے کی ستم ظریفیوں سے نبرد آزما ہو سکتا ہوں آؤ رتن آؤ! —— وہ گزرے ہوئے پُر مسرت دن، وہ جاوداں لمحے ہمیں آواز دے رہے ہیں۔ آؤ، ہم لوٹ چلیں اُس ماضی کی طرف جہاں میں تھا، تم تھیں۔ محبت کے لطیف جذبے تھے۔ ہمارے دلوں کی ہم آہنگ دھڑکنیں تھیں۔" میری آواز میں پیار کی شدت تھی۔ تڑپ تھی۔ طلب تھی۔

"سچ!" رتن کی وہی مانوس سی خیرہ کن چمک عود کر آئی، جیسے گہری تاریکی میں کہیں جوت سی جل رہی ہو۔ عارض شفق گوں ہو گئے اور اُن پر روپہلی کرنوں کا عکس تڑپنے لگا۔ ہونٹوں پر کلیاں چٹکنے لگیں۔

میرے دل کو قرار آ گیا۔ میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔
"آؤ! بیٹھو! آج میں تمھیں گھر لے چلوں گا، اپنے گھر، ہمیشہ کے لیے!"
میرا لہجہ پُر مسرت تھا۔

اور پھر رتن کی آنکھوں میں جلتی ہوئی جوت بجھ گئی۔ شفق گوں عارضوں سے پھوٹتی ہوئی روپہلی کرنیں نہ جانے کن اندھیروں میں گم ہو گئیں۔ ہونٹوں کی کلیاں، مرجھا گئیں۔

"نہیں، شکریہ!"

رتن نے اور کیا کہا، میں نے کیا سنا۔ کچھ یاد نہیں۔ لیکن جب میرے اندر کا طوفان تھما تو دیکھا رتن جا چکی تھی۔!!!

★★★

کینسر کے مریض

اس کا سفر جاری ہے ۔ اور اس کے ساتھ میرا بھی ......

ہم دونوں کا ساتھ ازلی ہے ، اُس سے الگ میری کوئی حیثیت کوئی اہمیت نہیں ۔ ہمارے درمیان وہی رشتہ ہے جو پھول سے خوشبو کا ۔ دل سے دھڑکن کا اور مکان سے مکیں کا ہوتا ہے ۔ بہ ظاہر ہم ایک ہیں ، لازم و ملزوم جیسے ۔ لیکن — حقیقتاً میں اس کے بغیر کچھ نہیں ہوں ۔ اگر کچھ ہوں تو وہ اجزا جن کے ترکیب سے میری تکمیل ہے ۔ اور میرے اجزا کو ایک نہ ایک دن بکھرنا ہے منتشر ہونا ہے ۔ اپنے بکھر جانے کے یقین کے باوجود میں طویل مدت تک بکھرنا نہیں چاہتا خود کو کھونا نہیں چاہتا ۔ اس لیے اپنے اجزا کو سمیٹے اس کے ساتھ ہوں — قدم بہ قدم — !

جب مسلسل سفر ، اور سفر کی مسلسل صعوبتوں کے احساس سے میں خود کو تھکا تھکا ، نڈھال نڈھال سا محسوس کرتا ہوں ۔ تو اس کے راستے میں حائل ہونے کی کوشش کرتا ہوں ۔ اُسے روک لینا چاہتا ہوں ۔ اپنے اندر قید کر لینا چاہتا ہوں ۔ اُسے ٹوکتا ہوں ۔

"تم تھکتے کیوں نہیں ؟ کہیں رُکتے کیوں نہیں ؟" اور مجھے جواب ملتا ہے

"تھکنا ، مقصد کی موت ہے اور رکنا زندگی کی ..... !"

"تو پھر کہاں رکنا ہے تمھیں ؟ کہاں ہے تمھاری منزل ؟" میں جھنجھلا جاتا

ہوں اور میری سماعت تک اس کی پُر سکون آواز پہونچتی ہے۔

"جہاں میں رُک جاؤں گا وہیں میری منزل ہوگی۔ اور — تب میں تم سے جدا ہو جاؤں گا، تم بکھر جاؤ گے!"

"تو کب آئے گا وہ دن — وہ وقت جب تم مجھ سے ......!"

اس سے جدا ہو جانے کا خوف میری قوت گویائی پر مسلط ہو جاتا ہے۔ وہ ہماری کیفیت کو سمجھ لیتا ہے مجھے اپنے اندر اتارنے کی کوشش کے ساتھ کہتا ہے

"میرے ہم سفر، بچھڑنا تو لازمی ہے، یقینی ہے، غیر فانی زندگی کے لیے۔ لیکن میں تم سے اس وقت تک بچھڑنا نہیں چاہتا جب تک دنیا مجھے تسلیم نہ کرے اور جس دن میں تسلیم کر لیا جاؤں گا، اس دن امر ہو جاؤں گا اور تمھارے بغیر بھی زندہ رہوں گا — صدیوں!"

اور میں خاموش ہو جاتا ہوں، خود کو اس کے سپرد کر دیتا ہوں۔

— میں اس آگ سے واقف ہوں جو اُس کے اندر جل رہی ہے، یہ آگ اس کی اپنی لگائی ہوئی نہیں ہے یہ نفرت و تفریق، بغض و حسد ظلم و جبر کی آگ ہے جو سب کچھ جلا کر راکھ کر دینا چاہتی ہے۔ اور اس نے اس آگ کو اپنے اندر بھر لیا ہے۔ تاکہ سب کچھ جل کر راکھ ہو جانے سے بچ جائے۔ مجھے معلوم ہے اس کے اندر جس درد کی لہریں مچل رہی ہیں وہ درد اس کا اپنا درد نہیں، اوروں کا درد ہے، تڑپتی بلکتی انسانیت کا درد ہے جو اس کے اندر ایک مرکز پر سمٹ آیا ہے — اور اس کی ساری جد و جہد انسان اور انسانیت کی بقا کے لیے ہے۔

— ایسا نہیں ہے کہ وہ زندگی کے کسی چوراہے سے بلا مقصد کسی طرف چل پڑا ہے، اور چل رہا ہے۔ وہ زندگی کو یونہی گزار دینے کا قائل نہیں۔ جب اس نے زندگی کو سمجھا۔ زندگی کی قدر و قیمت سے واقف ہوا تو خود کو پرکھا، اپنے وجود کی اہمیت کا اندازہ لگایا تو اپنے آپ کو زندگی کے اس چوراہے

پر لا کھڑا کیا، جہاں سے مختلف راستے مختلف سمتوں کو جاتے ہیں، ان راستوں میں سہل اور دشوار راستہ بھی ہے، ہموار اور ناہموار بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

— اور سفر کی بے انتہا صعوبتوں سے واقف ہوتے ہوئے اس نے، انتہائی دشوار گزار راستے کا انتخاب کیا اور چل پڑا ۔ اس منزل کی طرف جانا آسان نہیں، جو بلند و بالا ہے آسمان کی بلندیوں کی طرح ۔ وسیع و عریض ہے بیکراں خلاؤں کی طرح!

اُسے معلوم ہے کہ وہ منزل تک پہنچنے کے لیے جس راستے پر گامزن ہے وہ سہل اور آسان راستہ نہیں، اس راستے پر بے شمار دشوار گزار موڑ آئیں گے ۔ ان گنت حوصلہ شکن نشیب و فراز سے دوچار ہونا پڑے گا ۔ لاتعداد رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ پے بہ پے صبر آزما لمحوں سے نبرد آزما ہونا پڑے گا، اور ایسی بھیڑ سے گزرنا پڑے گا جس بھیڑ میں بڑی بڑی اور قدر آور شخصیتیں بھی گم ہوکر رہ گئی ہیں ۔ اس ہجوم بیکراں سے نکلنا پڑے گا جس ہجوم کے گھنے اندھیروں میں اجالوں کی کرنیں بکھیر دینے والی آوازیں بھی بے ربط و بے ہنگم آوازوں میں گڈمڈ ہوکر رہ گئی ہیں ۔ — اور وہ ان تمام صعوبتوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہے، اس لیے کہ اس کے حوصلے بلند ہیں ۔ ارادے مستحکم ہیں، دل میں منزل کو پالینے کی، خود کو اہلِ نظر کی نظروں میں تسلیم کرا لینے کی لگن ہے ۔ سچی، پُرخلوص —!

اُسے پتہ ہے کہ وہ اس راستے پر چل رہا ہے جس راستے پر اُسے خون بھی تھوکنا پڑے گا، دیدہ ریزی، عرق ریزی اور جگر سوزی بھی کرنی پڑے گی اور اس کا کہنا ہے ۔ کامیاب زندگی کے سفر کا لطف سہل اور ہموار راستوں پر نہیں، دشوار اور ناہموار راستوں پر ہے، با مقصد زندگی کا مزہ نرم اور گداز مخملیں بستر پر نہیں، پھولوں کی سیج پر نہیں، کانٹوں پر کروٹیں بدلنے میں ہے زندگی کی کامیابیاں گلزاروں سے گزر کر نہیں، ریگ زاروں، خارزاروں اور

سنگ خاروں سے گزر کر حاصل ہوئی ہیں۔ وہ کہا کرتا ہے۔ زندگی قہقہہ زاروں میں نہیں سنورتی۔ غموں کی تیز دھوپ میں تپ کر نکھرتی ہے اور وہ آگے بڑھ رہا ہے خون تھوکتا۔ —— وہ آگے بڑھتا ہی جا رہا ہے، اور اس کی دیدہ ریزی ریگ زاروں، خارزاروں اور سنگ خاروں کو گلزار بناتی جا رہی ہے۔ وہ آگے قدم بڑھا ہی جا رہا ہے اور اس کی عرق ریزی و جگر سوزی زندگی کے اندھیروں میں صحت مند اور انمٹ اجالے بکھیرتی جا رہی ہے۔ وہ آگے بڑھتا جا رہا ہے اور اس کے نقشِ قدم غیر مبہم سے مبہم اور پھر واضح سے بہت واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ آگے بڑھ رہا ہے اپنے راستے میں آنے والے ہر سنگ میل کو اپنی منزل کا نشان سمجھتا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنا، کہیں رک کر دم لینا اپنے سفر کی توہین سمجھتا ہے۔ وہ جہاں تک پہونچ چکا ہے، وہیں رک کر اپنے معتبر ہونے کا، اپنی شخصیت کے نمایاں ہونے کا اعتراف زمانے سے کرا سکتا ہے لیکن —— وہ آگے بڑھ رہا ہے۔ بڑھتا ہی جا رہا ہے!۔

—— وہ اپنے سفر کا نصف راستہ بھی طے نہیں کر پایا ہے کہ شب تاریک کے کتوں کی ڈراؤنی آوازوں کی سی کتنی ہی آوازیں اُسے خوف زدہ اور ہراساں کرنے کی کوششیں کرنے لگی ہیں۔ حسد کے ہاتھوں اس کے راستے میں نفرتوں کے کانٹے بچھائے جانے لگے ہیں۔ طنز کے زہر میں بجھے لفظوں کے زہریلے تیر بغض کی کمانوں سے نکل نکل کر اس کے گرد برسنے لگے ہیں۔ نفرتوں سے سکوڑے گئے ہونٹوں سے اُبلا ہوا دُشنام طرازیوں کا طوفان اسے اپنی لپیٹ میں لے لینے کے لیے مچلنے لگا ہے، تہمت و الزام کی غلاظتیں اُس پر اچھالی جانے لگی ہیں۔ تعصب کے ہاتھوں اس کی راہ میں حسد کی دیواریں کھڑی کی جانے لگی ہیں۔ لیکن —— وہ اپنے راستے میں بچھائے گئے نفرتوں کے کانٹوں سے اس طرح بچ کر نکل جاتا ہے کہ ایک بھی کانٹا اس کے پائے استقلال میں نہیں چبھتا۔ وہ اس محتاط انداز سے قدم آگے بڑھا رہا ہے کہ طنز کے زہر میں بجھے لفظوں کے زہریلے تیر اسے چھو بھی نہیں

پاتے ہیں۔ اس کمال ہوشیاری سے اپنا راستہ طے کرتا ہے کہ دشنام طرازیوں کے
کے طوفان سے اس کی شخصیت کا ایک گوشہ بھی متاثر نہیں ہوتا۔ اس جرأت سے
جست لگاتا ہے کہ اپنے راستے میں حائل حسد کی دیواروں سے اسے ٹھوکر بھی نہیں لگتی
ہے۔

لیکن، جب میرے صبر کا پیمانہ بریز ہو گیا تو میں خود کو نہ روک سکا

"سن رہے ہو ان آوازوں کو ؟"

وہ چونک پڑا۔ جیسے اس کے اپنے عمل اور شخصیت کے درمیان میری مداخلت
غیر متوقع ہو۔ پھر اس نے کہا۔

"ہاں سن رہا ہوں سب کچھ، ایک ایک لفظ کو !"

"اور یہ بھی محسوس کر رہے ہو کہ اُن آوازوں میں صرف اجنبی آوازیں ہی
نہیں جانی پہچانی آوازیں بھی ہیں۔ ؟"

"ہوں !" وہ پُر سکون تھا۔

میں نے تنک کر کہا۔

"تو پھر یہ بے حسی کیوں ؟ پلٹ کر دیکھ لو، کم سے کم اُن چہروں کو جو اپنے
ہیں، جانے پہچانے ہیں۔"

"نہیں میں ان آوازوں کو بے نقاب کرنا نہیں چاہتا۔ اپنے پن کا بھرم
قائم ہی رہے تو اچھا ہے !" اس نے سکون سے جواب دیا۔

"اُف ! یہ صبر، یہ ضبط، یہ تحمل ! یہ انسان ہے یا فرشتہ ؟" میں
سوچنے لگا۔ تھوڑے توقف کے بعد کہا۔

"پھر بھی تمھیں پلٹ کر دیکھنا چاہیے، تمھیں کچھ کہنا چاہیے، ورنہ — وہ
تمھیں بزدل سمجھیں گے انھیں اور شہ مل جائے گی۔"

میں نے محسوس کیا، اس کے لبوں پر ایسی مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔ جیسے
گہری تاریکی میں ہر طرف چراغ روشن ہو گئے ہوں، متانت سے بھرپور لہجے میں

مجھے اس کا جواب ملا۔

"نفرت کا جواب نفرت، طنز کا جواب طنز اور گالیوں کا جواب گالیاں، ہرگز نہیں۔ اگر ایسا کروں تو مجھ میں اور ان میں فرق ہی کیا رہ جائے گا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ میں ایسے دیرانہ اقدام کا قائل نہیں جس سے اخلاقی قدریں پامال ہوتی ہوں، انسانیت کا وقار مجروح ہوتا ہو۔ اس لیے ــ میں بزدل ہی ٹھیک ہوں۔"

وہ پیغمبر نہیں تھا، لیکن اس کی باتیں پیغمبرانہ تھیں۔ وہ درویش بھی نہیں تھا، لیکن اس کے خیالات درویشانہ تھے۔ میں نے محسوس کیا اس نے مجھے اپنی باتوں سے اس حد تک قائل کر دیا ہے کہ اب میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا۔ پھر بھی اپنی خفت مٹانے کے لیے میں نے کہا،

"پھر بھی تمہیں کچھ کرنا چاہیے۔ پلٹ کر انہیں دیکھنا چاہیے۔!"

پھر تو ایسا ہی معلوم ہوا جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ اور الفاظ کی صورت میں لاوے ابل پڑے ہوں، اس کے گرد پھیلی ہوئی تمام طمانیت و شگفتگی یکلخت مفقود ہو گئی۔ سکون درہم برہم ہو گیا۔ وہ مضطرب ہو گیا، اس طرح جیسے اس کے اندر درد و کرب کی نوکیلی کرچیں دور تک اترتی چلی گئی ہوں، شدت کرب سے وہ چیخ پڑا۔

"نہیں! اگر میں ذرا بھی رکا تو میرے راستے میں بچھائے گئے نفرتوں کے کانٹے میرے تلووں ہی میں نہیں، روح کی گہرائیوں تک میں چبھ جائیں گے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی پلٹ کر دیکھا تو بغض کی کمانوں سے نکلے طنز کے زہر میں بجھے لفظوں کے زہریلے تیر میرے وجود کو چھلنی کر کے رکھ دیں گے۔ اگر میں ایک پل کے لیے بھی ٹھہرا تو دشنام طرازیوں کا طوفان مجھے پاش پاش کر دے گا، ایک لمحہ کے لیے بھی رکا تو تہمت کی غلاظتوں سے خود کو آلودہ ہونے سے نہ بچا سکوں گا۔ اگر ایک ثانیہ کے لیے تھما تو حسد کی دیوار دل سے ٹکرا ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا۔ بکھر جاؤں گا، پھر تو منزل کو پا لینے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اس لیے مڑے بغیر، پلٹ کر

دیکھے بغیر رُکے بغیر میرا سفر جاری رہے گا۔ ـــ جاری رہے گا۔ ـــ جاری رہے گا۔ اس کے قدم اور تیز ہو گئے۔

طویل وقفے کے بعد ـــ

جب میں نے محسوس کیا کہ طوفان آکر گزر چکا ہے، اس کی حالت معمول پر آگئی ہے تو میں نے اپنے لہجے میں ٹھہراؤ، سنجیدگی اور مربیانہ انداز پیدا کرتے ہوئے سہم سہم کر کہا۔

"جو لوگ تمھارے راستے میں نفرتوں کے کانٹے بچھا رہے ہے، تم پر طنز کے تیر برسا رہے ہیں، گالیوں کی غلاظتیں اچھال رہے ہیں۔ حسد کی دیواریں کھڑی کر رہے ہیں۔ ان کے لیے تمھیں کچھ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ سلسلہ بند ہو۔ تم سکون کی سانس لے سکو، حصولِ مقصد کی طرف پوری توجہ دے سکو،!"

اور جیسے اُس کے اندر زمانے بھر کا درد سمٹ آیا، ایک لمبی سرد سانس کے درمیان بولا۔

"کر رہا ہوں ـــ کر رہا ہوں میرے دوست!"

"کیا؟" ـــ میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"وہی جو میں کر سکتا ہوں، جو مجھے کرنا چاہیے" اس کے ہونٹوں پر صبح کی پہلی کرنوں جیسی مسکراہٹ اور واضح ہو گئی تھی۔ آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں پر مچلتی سنہری کرنوں میں اس کا چہرہ شفق گوں ہو کر اور پُر نور ہو گیا تھا اور مجھے محسوس ہونے لگا یہ چہرہ کسی فرشتہ کا چہرہ نہیں تو کسی عام انسان کا بھی چہرہ نہیں ہے میرا تجسس اور بڑھ گیا۔

"کچھ کہو بھی، آخر کیا کر رہے ہو تم؟"

اُس نے مجھے دیکھا، پھر نظریں اوپر اٹھا کر دور آسمان کی بیکراں خلاؤں میں جھلملاتے ہوئے خواب آلود لہجے میں بولا۔

"دعائیں!"

میں چونک گیا۔ جیسے یہ آواز آسمان کی بلندی سے آئی ہو، غیب سے آئی ہو۔

"کیا ؟" میں اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکا

"دعائیں !" اس نے پھر اس محترم و مقدس لفظ کو دہرایا۔

"دعائیں ! دعائیں کیوں ؟" میں خود کو ٹوٹتا اور بکھرتا محسوس کرنے لگا تو اپنے آپ کو اس سے الجھ جانے پر آمادہ کرنے لگا۔

اس نے میری اضطرابی کیفیت کو محسوس کر کے مجھے سنبھالنے کی کوشش کی مجھے منتشر ہوتا دیکھ کر اپنے اندر سمیٹنے لگا۔ اور اپنے لہجے کی نرمی کو برقرار رکھتے ہوئے افسوس اور ہمدردی کی ملی جلی کیفیت کی سی آواز میں سرگوشی کی۔

"دعائیں اس لیے کہ وہ سب مریض ہیں ـــ ذہنی کینسر کے مریض !"

میں گھبرا گیا۔ میرے باہر ہر طرف چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں تو اپنے اندر پناہ ڈھونڈنے لگا۔ اس لیے کہ میرے اندر کا فنکار پر سکون تھا ـــ مطمئن تھا !!

***

رسم وفا

میں اپنے چیمبر (Chamber) میں بیٹھا سامنے پھیلے ہوئے کاغذات میں کھویا ہوا تھا کہ ایک نسوانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"May I come in ?"

میں نے اس نسوانی آواز کی طرف اس لیے دھیان نہ دیا کہ میرے آفس میں دو ٹائپسٹ لڑکیوں کے علاوہ دو کلرک لڑکیاں بھی تھیں جنھیں دفتری امور کے سلسلے میں کئی کئی بار میرے چیمبر میں آنا پڑتا تھا۔ میں نے سر جھکائے ہوئے ہی حسب معمول مختصر سا جواب دیا۔ " yes ! " لیکن جب سر اٹھا کر دیکھا تو مبہوت ہو کر رہ گیا۔ آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی ہے۔ لیکن اس کے باریک اور خوبصورت ہونٹوں پر لہراتی ہوئی جانی پہچانی سی دل کش مسکراہٹ کہہ رہی تھی۔

"ہاں، ہاں، میں وہی ہوں سریتا! جو مہینوں تمھارے قریب رہی ہے۔"

"سریتا تم اور یہاں ؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"کیوں، مجھے یہاں نہ آنا چاہیے۔ ؟"

میں سٹپٹا گیا۔ "نہیں نہیں، یہ بات نہیں، برسوں بعد یوں اچانک تمھیں، دیکھ کر محسوس ہوتا ہے۔ جیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔ کھڑی کیوں ہو بیٹھو نا!"

"میں خواب نہیں حقیقت ہوں!" وہ شانے پر آنچل درست کرتے ہوئے میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میری یاد کیسے آئی تمھیں؟" میں نے مسکرا کر آگے جھکتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑے توقف کے بعد بولی "یوں تو آپ اکثر یاد آتے رہے۔ لیکن اس وقت میں اس فرم کے جنرل منیجر سے ملنے آئی ہوں، اور وہ بھی ایک غرض لے کر" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں ہی تو ہوں جنرل منیجر!" سوچا اس انکشاف پر وہ چونک جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس نے کہا۔

"معلوم ہے جب ہی تو آئی ہوں!"

"تو بتاؤ کیا غرض ہے تمھاری؟"

"سنا ہے منیجر کے لیے ایک پرسنل اسسٹنٹ (Personal Assistant) کی ضرورت ہے۔ سوچا دیرینہ تعلقات کی بنا پر ہی بحال کر لی جاؤں۔ درخواست بھی لیتی آئی ہوں!" اس نے وینٹی بیگ سے درخواست نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔

میں نے ایک سرسری نظر درخواست پر ڈالتے ہوئے پُر تشویش لہجے میں کہا "میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی!"

"کیا؟" وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

"یہی کہ تمھیں نوکری کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟"

"کیا اس سوال کا تعلق انٹرویو سے ہے؟"

"نہیں میں نے تو اس لیے پوچھا ہے کہ تم خود ایک......!"

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی "پلیز (Please) ایسا کوئی تذکرہ میرے لیے تکلیف کا باعث ہوگا!" وہ اداس ہو گئی۔

"اوہ ساری (oh sorry) مجھے کیا معلوم تھا!" میں نے اس کے چہرے پر چھا جانے والی اداسی کو محسوس کیا اور خاموش ہو گیا۔

"کیا امید کروں کہ یہ جگہ مجھے مل جائے گی۔" اس نے خود ہی سکوت توڑا

"مل جائے گی نہیں، سمجھ مل گئی! لیکن اس شرط پر کہ یہ آپ آپ کی رٹ نہ چلے گی۔" میں نے اس کی طرف اشتیاق سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دفتری اوقات میں تو اس کا خیال کرنا ہی پڑے گا!" وہ پھر مسکرانے لگی!
میں لاجواب سا ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔

—— سریتا قریب رہ کر بھی مجھ سے دور تھی۔ بہت دور، اس کی رفاقت جہاں میرے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا موجب ثابت ہو رہی تھی، وہاں برسوں پہلے جن لطیف جذبوں اور خوشگوار احساسات نے اس کی طرف سے مایوسیوں کی تاب نہ لاکر درد کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک بار پھر وہ درد کی شدت سے جاگ اٹھا تھا کبھی کبھی تو اس درد کا احساس اتنا شدید ہو جاتا کہ میں بے چین ہو جاتا اور ماضی کی یادوں میں کھو کر سوچنے لگتا۔ کاش سریتا میری ہوتی، اس کا مہکتا دمکتا خوبصورت پیکر میرا ہوتا، اس پر میرا مکمل اختیار رہتا۔ —— کاش —!

تین سال پہلے —— میں موتی ہاری میں برانچ مینیجر تھا۔ سریتا کے مکان سے ملے جُلے فلیٹ میں رہتا تھا، آتے جاتے روز ہی ہم ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تھے۔۔ ایک رات دس بجے تھے، میں اپنے کمرے میں لیٹا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، دروازہ کھولا تو دیکھا سریتا گھبرائی گھبرائی سی کھڑی ہے۔ میں اُسے حیرت سے تک ہی رہا تھا کہ اس نے کہا۔ "پتا جی عظیم آباد گئے ہیں، ماں کو اچانک بہت تیز بخار ہو گیا ہے، میں انھیں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو بلا دیجیے!" ایک تو لڑکی، جوان اور خوبصورت، دوسرے اُس کی آنکھوں میں آنسو، تیسرے پڑوسی ہونے کا حق۔ میں انکار نہ کر سکا۔ فوراً کہا۔ "آپ گھر جائیے میں ڈاکٹر کو لے کر ابھی آتا ہوں!" —— اور پھر میں نے سریتا کی ماں کی دیکھ ریکھ۔ تیمار داری اور پڑوسی ہونے کا حق اس تندہی سے ادا کیا کہ وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئی۔ —— ملاقاتیں ہوتی رہیں —— دن گزرتے گئے —— اور وہ میرے دل و دماغ پر چھاتی چلی گئی۔ میں اُسے شدت سے پیار کرنے لگا۔ اور

اور محسوس کرنے لگا کہ سریتا کے بغیر میری زندگی ویران اور سنسان ہی رہے گی
سریتا میرے ساتھ جس خلوص اور محبت سے پیش آتی اس سے میں نے یہی اندازہ
لگایا کہ وہ بھی مجھ سے ویسی ہی محبت کرتی ہے جیسی میں کرتا ہوں، اُسے بھی میرے بغیر
چین نہ آئے گا ——— اپنے یقین کی بنا پر ایک دن اُسے بہت خوش دیکھ کر میں
نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"سریتا! اچھا ہوتا کہ اب ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جاتے؟"
وہ اس طرح چونکی جیسے میں نے خلاف توقع کوئی بات کہہ دی ہو۔ اس کے
چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، ہونٹ اس طرح لرزنے لگے جیسے کچھ کہنا چاہتی
ہو۔ لیکن الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ اُسے خاموش دیکھ کر میں نے دھڑکتے دل سے کہا
"بولو سریتا! کیا خیال ہے تمھارا؟"

اس نے نگاہیں نیچی کرلیں اور بہ مشکل کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔
"نہیں منوج! میں کمل کو دھوکا نہیں دے سکتی!"

"کمل!" میں چونک گیا اور تذبذب کے عالم میں اُسے تکنے لگا۔ سریتا
کے منہ سے پہلی بار یہ نام سنا تھا۔

"ہاں کمل! وہ میرا منگیتر بھی ہے ——— ہماری شادی میں اب بہت کم دن
رہ گئے ہیں!"

ہمارے گرد فضا بوجھل سی ہوگئی۔ میں نڈھال ہوگیا۔ وہ کچھ اور کہے
بغیر میرے پاس سے اُٹھ گئی۔ میں اُسے روک بھی نہ سکا۔ میرا دل کچھ اس طرح
تڑپا کہ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں سوچنے لگا کیا اسی دن کے لیے سریتا کو پیار
کیا تھا؟ اُسے آنکھوں میں بسا رکھا تھا۔ اسے اپنا بنا کر خوش آئند مستقبل کے
سنہرے سپنے دیکھا کرتا تھا۔ اُف! کتنا جانکاہ تھا سریتا کا یہ انکشاف۔

اور چند ہی مہینوں بعد میرے سامنے ہی اس کی شادی کمل سے ہوگئی۔
سریتا کی ڈولی کی شکل میں میری آرزوں اور تمناؤں کا جنازہ اُٹھ گیا!

—— بہت کوششوں کے بعد مجھے اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ سریتا کمل سے بیزار ہو چکی ہے اور اپنی پچھلی زندگی یکسر فراموش کر دینا چاہتی ہے، لیکن مجھے اکثر یہ فکر ہو جاتی کہ اس کے اور کمل کے درمیان منافرت کے اسباب کیا ہیں؟ ان کی ازدواجی زندگی ایک دوسرے سے الگ ہو جانے کی حد تک ناخوشگوار کیسے ہو گئی جبکہ شادی ان کی اپنی مرضی اور پسند کے مطابق ہوئی تھی، ایک دن موقع دیکھ کر میں نے سریتا کو پھر کریدنے کی کوشش کی۔

"آخر کچھ بتاؤ بھی کہ تمھارے اور کمل کے درمیان اختلافات کی وجہ کیا ہے؟"
اس کے چہرے پر کرب سا اُبھر آیا۔ اُس نے غور سے میری طرف دیکھا اور نظریں جھکاتی ہوئی بولی۔

"میں نہیں چاہتی کہ تمھیں اپنے غم میں شریک کروں، لیکن تم بضد ہو تو سنو!"
"یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ کمل اور میں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ شادی کے بعد بھی ہماری چاہت میں کوئی فرق نہ آیا۔ ہماری ازدواجی زندگی بہت ہی خوشگوار اور پُر سکون گزر رہی تھی۔ لیکن دو سال کے بعد کمل کے رویے میں فرق آنے لگا وہ مجھ سے غافل اور لاپرواہ رہنے لگا، آدھی آدھی رات تک گھر سے باہر رہنے لگا ایک رات جب وہ گھر آیا تو میں اس کے پاس گئی تاکہ معلوم کر سکوں کہ وہ اتنی اتنی رات تک کہاں رہتا ہے کیا کرتا ہے؟ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھوں یا وہ کچھ کہے مجھے شراب کی بو معلوم ہوئی، اور میں اس کے پاس سے ہٹ آئی، پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ وہ شراب بھی پینے لگا ہے۔ اُس رات میں بالکل نہ سوئی، ساری رات روتی رہی۔۔ اس رات کے بعد میرے اور اس کے درمیان جو ایک معمولی سی، جھجک تھی وہ بھی ختم ہو گئی اب وہ باہر سے پی کر آنے کے علاوہ گھر میں بھی پینے لگا میں کچھ کہتی یا روکتی تو سختی سے ڈانٹ دیتا، میں اندر ہی اندر جلتی رہی، سُلگتی رہی آنسو بہاتی رہی —— انھیں دنوں مجھے معلوم ہوا کہ وہ نلنی نام کی ایک لڑکی میں زیادہ دلچسپی لے رہا ہے اور آدھی آدھی رات تک کلبوں اور ہوٹلوں میں اُس کے ساتھ

رنگ رلیاں مناتا رہتا ہے۔ میں اور بھی پریشان ہو گئی اور ہونا بھی چاہیے۔ کوئی عورت
بھلا یہ کب چاہے گی کہ اس کا شوہر کسی اور عورت کے ساتھ رسم و راہ بڑھائے۔"
تھوڑی دیر کے وہ رکی اور ایک لمبی سانس لے کر پھر کہنے لگی — "ایک شام میں نے
کمل کا راستہ روک لیا اور کہا۔ "مجھے معلوم ہے تم روز ہی نلنی سے ملتے ہو۔ آدھی آدھی
رات تک اس کے ساتھ رہتے ہو۔ نلنی اچھی ہے یا بری، یہ میں نہیں جانتی۔ لیکن ذرا
سوچو، آخر مجھ میں کیا برائی ہے۔ وہ کون سی بات ہے جو نلنی میں ہے، مجھ میں نہیں
اور پھر میرا تم پر زیادہ حق ہے۔!" اس نے مجھے جھڑک دیا اور کہا، "میں تمھارے
حق کو خوب جانتا ہوں، بتانے کی ضرورت نہیں۔ رہنے کو شاندار مکان، پہننے کو
اچھے اچھے کپڑے، کھانے پینے کی ساری سہولیتیں! اور کیا چاہیے تمھیں؟ کیا تم یہ
چاہتی ہو کہ میں تمھارا غلام اور پابند ہو کر رہ جاؤں؟ — نلنی اچھی لڑکی ہے، مخلص
دوست ہے، تمھاری طرح تنگ دل نہیں!" — ایک دن پھر میرے ضبط کا
بند ٹوٹ گیا۔ ایک دن پھر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور کہا۔ "کمل! مجھ پر یوں
ستم نہ ڈھاؤ۔ میں وہی تو ہوں جس کے بغیر تمھیں ایک پل چین نہ ملتا تھا۔ خدا کے لیے
مجھ پر رحم کرو۔ بھول جاؤ نلنی کو۔ وہ ناگن ہے جو ہمیں ڈس رہی ہے ہمارے
کو ڈس رہی ہے۔ سنبھلو کمل! — کمل" کمل نے مجھے اس طرح جھٹکا کہ میں
دور جا گری۔ اُسے اتنے پر بھی صبر نہ آیا اور اس نے پہلی بار مجھ پر ہاتھ بھی اُٹھا
دیا اور کہا، "دور ہو جاؤ میری نظروں سے، نکل جاؤ اس گھر سے، اب اس گھر میں
نلنی ہی رہے گی، دیکھوں تم کیا کر لیتی ہو۔" — وہ پھوٹ پڑی اور ہتھیلیوں
میں چہرہ چھپا کر رونے لگی، میں اپنی جگہ بیٹھا حیرت سے اس کی داستانِ غم سُن
رہا تھا۔ جب وہ رونے لگی تو اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور دلاسہ دیتے ہوئے
کہا۔

"نہ رو سریتا! نہ رو، اچھا ہی کیا جو پھر اس درندے کے پاس واپس
نہ گئیں۔ اس نے تمھیں ٹھکرا دیا، دیکھنا ایک دن خود ٹھوکر کھائے گا! اب تو تمھیں

کچھ بھول کر ایک نئی زندگی شروع کرنی ہے نا، اس لیے حوصلہ رکھو ۔ ۔۔ اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔

— سریتا کی داستانِ غم سننے کے بعد مجھے اس سے اور بھی ہمدردی ہوگئی، لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ اس ہمدردی کے پیچھے وہ محبت پھر انگڑائی لینے لگی ہے جس کے اظہار کے بعد مجھے مایوس ہو جانا پڑا تھا۔ رہ رہ کر خیال آتا کیوں نہ ایک بار پھر اپنی اس خواہش کا اظہار کر دوں جو تین سال پہلے کر چکا تھا۔ لیکن یہ سوچ کر ڈر جاتا کہ سریتا نے پھر انکار کر دیا تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا ہو سکتا ہے اُس کے اور کمل کے درمیان صلح ہی ہو جائے

— اور ایک دن اس کا قطعی فیصلہ جاننے کے لیے میں نے قصداً پھر کمل کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

"تم کہو تو میں کمل سے ملوں ؟"

"کیوں ؟" وہ گھبرا گئی۔

اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ تمھارے اور کمل کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔"

"نہیں، اب کمل میرے پاؤں پڑے جب بھی واپس نہ جاؤں گی اور نہ مفاہمت کی کوئی بات ہی میرے لیے قابلِ قبول ہوگی!" اس کا لہجہ گمبھیر بھی تھا اور سخت بھی!

"تو کیا کمل سے قطع تعلق کا قطعی فیصلہ کر چکی ہو؟"

"ہاں، میرے اس فیصلے کو کوئی نہیں بدل سکتا! ۔ کمل بھی نہیں تم بھی نہیں۔"

"تو پھر آگے کے لیے کیا سوچا ہے ؟" میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا!

"ظاہر ہے پوری زندگی تنہا نہیں گزار سکتی، کوئی نہ کوئی تو سہارا ڈھونڈنا ہی پڑے گا!" اس نے میری طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

میرا دل اور تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے ڈر ڈر کر کہا "ایسا ہی ہے تو میرے بارے میں کیا خیال ہے تمھارا؟"

"کیا تم یہ نہ سوچو گے ۔ یہ دو سال کسی اور کے ساتھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس نے

اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور میری طرف کنکھیوں سے دیکھا۔

"تمھارا قرب مجھے یہ سوچنے کا موقع ہی کہاں دے گا۔" میرا حوصلہ بڑھ گیا اطمینان کی سانس لے کر اس کے قریب کھسک گیا۔

"تو پھر ابھی نہیں، کچھ اور انتظار کرو!" وہ ایک ادا سے مسکرا کر دور کھسک گئی۔

میرے لیے یہ بات کم خوش کن نہ تھی کہ سرتیا مجھے پسند کر چکی ہے، اب مجھے شدت سے اس دن کا انتظار تھا، جس دن وہ خود یہ کہہ دے گی — منوج! آج سے ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔ آج تم مجھے اپنی بنا لو!"

آج سرتیا خلاف معمول سویرے ہی سے خاموش، اداس اور کھوئی کھوئی سی نظر آ رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر بھی اس نے اس اداسی کی وجہ نہ بتائی۔ اور ٹال گئی شام کو آفس چھوڑنے کے بعد میں اسے بھی ساتھ اپنے فلیٹ لیتا آیا۔ سوچا اطمینان سے باتوں کے دوران اس اداسی کی وجہ بھی جان لوں گا اور اس کی طبیعت بھی بہل جائے گی۔ جب میں کپڑے بدل کر ڈرائنگ روم میں واپس آیا تو دیکھا وہ آنکھیں بند کیے صوفہ پر نیم دراز ہے، شانے سے ڈھلکا ہوا آنچل بتا رہا تھا کہ وہ کسی خیال میں کھو کر اپنے آپ سے بھی بے گانہ ہو گئی ہے۔ مجھے اس کا یہ انداز بہت ہی پیارا معلوم ہوا۔ میری نگاہیں اس کے خوبصورت جسم کو چومنے لگیں۔ گھنیری زلفیں، چاند سی پیشانی، گہری نیل گوں جھیل جیسی آنکھوں پر گھنی پلکوں کے سایے، یہ صبیح رخسار گلاب کی پنکھڑیوں جیسے باریک ہونٹ۔ سیولیس بلاوز سے باہر کھلے ہوئے سڈول بازو، گلے سے نیچے، بہت نیچے تک چکنی اور صاف شفاف جلد اور — اور میری سانسیں الجھنے لگیں، آنکھوں میں سرور سا چھانے لگا۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں اور اس کے خوبصورت جسم کے لمس کے احساس سے میرے اندر ایک آگ سی سلگ اٹھی۔ ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے — وہ اس طرح چونک کر کھڑی ہو گئی، جیسے کسی ان دیکھی قوت نے اسے

اچھال دیا ہو۔ اور وہ کئی قدم پیچھے ہٹ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرح مجھے دیکھنے لگی۔ جیسے میں کوئی اجنبی ہوں، مجھے حیرت ہوئی۔ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ بقیہ زندگی میرے ساتھ گزارنے کا خود بھی فیصلہ کر چکی ہے، میں نے بارہا اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا تھا۔ اپنی مرضی کے مطابق اُسے بازو سے پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیتا اور کہتا۔ "تم میرے قریب ہوتی ہو تو محسوس ہوتا ہے دنیا کی ساری خوشیاں سمٹ کر میرے پاس آگئی ہیں۔" وہ جواب میں دلبرانہ انداز میں مسکرا دیتی تھی اور میں مچل مچل جاتا تھا۔ لیکن آج ___ میں نے خود کو تسلی دیتے ہوئے سوچا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی خیال میں اس طرح کھوئی ہو کہ میرے شانوں پر ہاتھ رکھ دینے سے چونک پڑی ہو، ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ انسان کبھی کبھی غور و فکر میں کھو کر خود کو بھی بھول جاتا ہے۔ اور گرد و پیش کو بھی۔ ___ میں نے دونوں بازوؤں کو پھیلا کر اس کے قریب بڑھتے ہوئے کہا۔

"اداس کیوں ہو! یہاں تمھیں سب کچھ ملے گا، بے انتہا پیار، بے شمار خوشیاں۔ کھویا ہوا سکون، روٹھی ہوئی بہاریں ___ سب کچھ۔" اور اس سے پہلے کہ آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا، وہ مڑی، اور تیز تیز قدم بڑھاتی فلیٹ سے باہر نکل گئی۔ میں حیرت و استعجاب کے عالم میں کھڑا اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

___ دوسرے دن آفس پہونچ کر میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ میری نظر میز پر رکھے لفافے پر پڑی۔ لفافے پر میرا ہی نام لکھا تھا۔ تحریر بھی جانی پہچانی تھی۔ میں نے لفافہ اٹھایا، چاک کیا اور خط پڑھنے لگا، میں خط پڑھتا رہا، ہاتھ کانپتے رہے، آنکھیں متحیر ہوتی گئیں۔ سریتا نے لکھا تھا۔

"منوج! تم نے مجھے اچھی ملازمت دی، پیار دیا، مستقبل کے سہانے سپنے دیئے اور میں ان احسانوں کے بدلے ایک بار پھر تمھارا دل توڑ رہی ہوں، سوچا تھا خود کو تمھارے سپرد کر کے کمل سے انتقام لوں۔ اس لیے کہ اس نے مجھے

بے حد تڑپایا ہے۔ اس انتقامی جذبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میری نظر انتخاب تم پر پڑی، سوچا تم مجھے پہلے بھی چاہ چکے ہو، اب بھی مجھ پر رِیجھ جاؤ گے۔ اتفاق سے تمھیں پرسنل اسسٹنٹ کی ضرورت پڑی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے خود کو اس لیے پیش کیا تھا کہ تمھارے قریب رہ کر تم پر زیادہ سے زیادہ اپنا اثر ڈال سکوں۔ میں جان بوجھ کر تم سے بے تکلف ہوتی گئی۔ تمھارے جذبات کو بڑھاوا دیتی رہی۔ اور تم میری مرضی کے مطابق، میرے قریب، بہت ہی قریب آتے گئے۔ اور عین اس وقت جبکہ میں سارے بندھن توڑ کر خود کو تمھارے سپرد کر دینا چاہتی تھی، مجھے پتہ چلا کہ وہ لڑکی (نلنی) کمل کو لوٹ کر فریب دے کر چلی گئی اور جاتے جاتے اُسے زندگی کے اس موڑ پر ڈال گئی ہے جہاں وہ موت کے دہانے پر کھڑا زندگی کے باقی دن سسک سسک کر گزار رہا ہے۔

— تم کہتے ہو میں بہت خوبصورت ہوں، کمل بھی یہی کہتا تھا، اور میں اس جملے کی سحر انگیزی میں کھو کر یہ بھول گئی تھی کہ عورت اس وقت تک عورت معلوم ہوتی ہے جب تک وہ عورت کے حصار میں رہے، کسی اور سے انتقام لینے کے بجائے خود سے انتقام لیتی رہے، — اس لیے اب میں واپس جا رہی ہوں — کمل کے پاس — اپنے کمل کے پاس — میں نہ گئی تو وہ تڑپ تڑپ کر مر جائے گا، پھر ایک عورت بھی مر جائے گی اور — اور رسم وفا بھی!!!

★★★

جیتی ہوئی بازی

کون جانتا تھا کہ ایک معمولی حادثے کے باعث وقت سے دو ماہ قبل پیدا ہونے والی دبلی پتلی مریل سی بچی بڑی ہو کر اتنی کجل، سڈول اور خوبصورت ہو گی۔

لاجونتی اور جسونت کو سینتا کی پیدائش کی وہ قیامت خیز رات آج بھی یاد تھی ——— کتنی کٹھن تھی وہ رات! ہوا صرف یہ تھا کہ لاجونتی سیڑھیوں سے اتر رہی تھی کہ آخری دو سیڑھیوں سے اس کے پاؤں پھسل گئے اور وہ اوندھے منہ گر پڑی۔ پھر تو جیسے پورے گھر میں بھونچال آ گیا تھا۔

لاجونتی پلنگ پر لیٹی پر کٹے پرندے کی طرح تڑپ رہی تھی، ایسا ہی معلوم ہوتا تھا، جیسے دوسرے ہی لمحہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے گی۔ دائی کا کہنا تھا کہ بچہ اپنی جگہ سے کھسک گیا ہے۔ کئی گھنٹے کی افراتفری اور بھاگ دوڑ کے بعد جب رات اپنے سفر کی آخری منزل طے کر رہی تھی اور کھیتوں کے بھاگ جگانے میں کسانوں کی مدد کرنے والے بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں تو جسونت کے گھر میں ایک ننھی منی بچی نے جنم لیا۔ ملال میں ڈوبے ہوئے چہروں پر خوشیوں کی قندیلیں روشن ہو گئیں۔

اور اب سینتا سترہ سال کی خوبصورت اور صحت مند لڑکی تھی۔ رنگ روپ اور چہرے مہرے میں وہ ماں سے بھی بڑھ کر نکلی تھی۔

دالان میں قدم رکھتے ہی جسونت کی نظریں سینتا پر پڑیں جو گرد و پیش سے بے خبر پنجوں کے بل کھڑی دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے امرود توڑ رہی تھی۔ دوپٹہ شانوں سے ڈھلک کر قدموں میں گر پڑا تھا، گھنگھور بالوں کی لمبی سی چوٹی کمر سے نیچے لٹک رہی تھی۔ بڑے بڑے سرخ بوٹوں والے

گھاگھرے کے سیاہ بورڈر کے نیچے گوری گوری سڈول پنڈلیاں اور پاؤں میں چاندی کی چھم چھم کرتی جھانجھر —— ایک باپ کی نظریں زیادہ دیر تک جوان بیٹی پر نہ ٹک سکیں۔ جسونت نے نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں اور ایک دم اسے خیال آیا کہ لاجونتی ٹھیک ہی کہتی ہے کہ سنیتا اب سیانی ہو گئی ہے۔ کل تک اس امرود کے لیے دوسروں کی محتاج تھی لیکن آج اس کے ہاتھ بلند ڈالیوں تک آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ وہ دالان میں بچھی ہوئی کھاٹ پر بیٹھ کر سنیتا کے مستقبل پر غور کرنے لگا۔

لاجونتی کئی بار اس سے کہہ چکی تھی کہ سنیتا کے لیے کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر بات پکی کر لو۔ لیکن وہ ہر بار لاجونتی کی بات یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ اتنی جلدی کیا پڑی ہے ابھی تو سنیتا بچی ہے، اور پھر ہماری سنیتا کے لیے لڑکوں کی کیا کمی ہے۔ لیکن آج جب سنیتا کے جوان ہونے کا احساس اچانک اس کے ذہن میں جاگا تو اس نے دور دور تک خیالوں کے گھوڑے دوڑائے اور جب سبھی گھوڑے خالی اور ناکام واپس لوٹ آئے تو اس نے محسوس کیا کہ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے اور سنیتا کے لئے کوئی اچھا لڑکا ڈھونڈ نکالنا ریت پر دھان کی فصل اگانے سے کم نہیں۔ وہ خیالوں کے لق و دق صحرا میں بھٹک رہا تھا کہ ذہن کے ایک گوشے کا بند دریچہ کھلا اور مایوسیوں کے گھنگھور اندھیروں کو چیرتی ہوئی امید کی ایک کرن جھانکنے لگی۔

"رام اوتار!"

لیکن رام اوتار کو بھی حاصل کرنا آسان نہیں۔ شاید منوہر اس رشتے کو پسند نہ کرے۔ ویسے سنیتا کے لیے رام اوتار سے اچھا لڑکا دور دراز تک ملنا مشکل ہے۔

جسونت اپنی سوچ میں اس قدر غرق تھا کہ اسے یہ بھی ہوش نہ رہا کہ سورج ایک بھٹکے مسافر کی طرح افق سے نیچے گرنے کو ہے۔ سنیتا نے اسے چائے تیار ہو جانے کی خبر دی تو اسے اپنی آنکھوں کی نمی اور ٹوٹی ہوئی رگوں کا احساس ہوا۔ اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور سنیتا کے پیچھے چل کر گھر میں داخل ہوا۔ آنگن میں بچھے ہوئے تخت کے ایک کنارے بیٹھی لاجونتی چائے بنا رہی تھی۔ جسونت نے کرتے کی جیب سے افیون کی ڈبیہ نکالی اور

مٹر کے دانے کے برابر افیون کی ایک گولی منہ میں رکھ کر گرم گرم چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے لاجونتی کو دیکھا جو اپنی پیالی میں شکر گھول رہی تھی۔ اس نے دو تین چسکیاں لے کر کہا۔ "تم ٹھیک ہی کہتی ہو، واقعی اب سیتا اس قابل ہو گئی ہے کہ اس کے لئے ایک اچھا لڑکا ڈھونڈا جائے۔"

"تو کیا کوئی لڑکا ہے تمھاری نظر میں؟" لاجونتی نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کیوں نہیں؟ اسی گاؤں کا لڑکا ہے۔" جسونت نے چائے کی خالی پیالی لاجونتی کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

"کون؟"

"رام اوتار!"

رام اوتار کا نام لے کر جسونت اس طرح لاجونتی کو دیکھنے لگا جیسے کوئی بہت حیرت انگیز بات کہہ گیا ہو۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے!" رام اوتار کے نام پر لاجونتی اس طرح چونکی کہ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی۔

"جیسے بھی ہو۔ رام اوتار جیسا لڑکا چراغ لے کر ڈھونڈو تب بھی نہ ملے۔ بانکا، سجیلا، ہونہار اور پڑھا لکھا۔"

"سو تو ٹھیک ہے، لیکن کیا تم سمجھتے ہو منوہر اس کے لئے راضی ہو جائے گا؟"

منوہر بُرا آدمی نہیں، اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنا کچھ ہو جانے کے بعد میری جان کا دشمن ہو جاتا اور پھر رام کی شادی کہیں نہ کہیں تو وہ کرے گا ہی۔ کیا حرج ہے، میں خود اس سے بات کر کے دیکھ لوں۔"

میں تو کہوں کی رام کا خیال دماغ سے نکال دو۔ منوہر کو آج بھی ساری باتیں کل ہی کی طرح یاد ہوں گی۔

"لاجو! یہ تو سچ ہے کہ تم سے بیاہ کر کے میں نے ایک اچھے دوست کو کھو دیا ہے لیکن اگر میں تم سے بیاہ نہ کرتا تو شاید زندگی بھر کنوارا ہی رہ جاتا۔ لیکن چھوڑو بہت پرانی ہو چکی ہیں

یہ باتیں۔ اب تو میں یہ چاہتا ہوں کہ منوہر کو کسی طرح راضی کر لیا جائے۔ سیتا کے لئے اچھا بر بھی مل جائے گا اور سترہ سال پہلے کی دوستی قریبی رشتے میں بھی بدل جائے گی۔"

"اگر تمھاری یہی ضد ہے تو کبھی منوہر سے مل لینا۔" لاجونتی نے بات ٹالنی چاہی اور چائے کی پیالیوں کو سمیٹنے لگی۔

جسونت دھول سے اٹی ہوئی کچی سڑک کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ منوہر کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اس طرح سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہا تھا جیسے برسات کی کائی جمی ہو، کہ سنبھل کر نہ چلے تو پاؤں پھسل جائے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ایسا نہ ہو منوہر رشتے کی بات سنتے ہی بھڑک اٹھے اور سختی سے انکار کر دے اور پھر وہ انکار کر دینے کے امکانات پر غور کرتے ہوئے سترہ سال پیچھے چلا گیا ——

جسونت اور منوہر بچپن کے دوست تھے، اور دوست بھی ایسے کہ ان کی دوستی کی مثال مشکل ہی سے ملتی۔ دونوں ایک دوسرے کے پسینے کی جگہ خون بہا دینے کو تیار رہتے۔

منوہر کی شادی کے دوسرے ہی سال اس کی بیوی ایک بچے کو جنم دیتے وقت چل بسی، گھر والوں کے بے حد اصرار کے باوجود منوہر دوسری شادی پر رضامند نہ تھا۔ گھر کی دیکھ بھال اور بچے کی پرورش کے حوالے سے جب بھی دوسری شادی کی بات آئی وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ ابھی تو کسم کی چتا بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ تین سال اسی طرح بیت گئے۔

ایک دن منوہر اپنے گاؤں سے پندرہ میل دور ایک نئی زمین خریدنے کے سلسلے میں راناگڈھ گیا تو اس کی ملاقات راناگڈھ کے ایک مالدار کسان کشن سے ہوئی۔ کشن منوہر کے باپ کا دوست تھا۔ جب دوپہر کے کھانے پر کشن منوہر کو گھر کے اندر لے گیا تو منوہر کی نظر لاجونتی پر پڑی اور اس کی آنکھیں لاجونتی کے انگ انگ سے پھوٹتی شباب کی کرنوں سے چکا چوند ہو گئیں۔ لاجونتی اسے کھانا کھلاتی رہی اور مستِ شباب لاجونتی کو نظریں بچا بچا کر دیکھتا رہا۔ جب کچھ رات گئے وہ اپنے گھر لوٹا تو وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ لاجونتی کا حسین اور پر کیف تصور بھی تھا۔

کچھ دن تک تو وہ زمین خریدنے کا بہانہ کر کے لاجونتی کو دیکھنے راناگڈھ جاتا رہا

اور جب زمین خریدلی تو اس کی دیکھ بھال اور کاشت کاری کا حیلہ اسے لاجونتی کے قریب کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔ رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ جب وہ دنیا والوں کے سامنے ملنے میں خوف محسوس کرنے لگے تو چھپ چھپ کر کھیتوں اور کھلیانوں میں ملنے لگے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ منوہر کی پہلی بیوی مرچکی ہے اور وہ ایک بچے کا باپ ہے، لاجونتی کی چاہت میں فرق نہیں آیا۔

لیکن منوہر کے لئے وہ دن بڑا منحوس ثابت ہوا جب وہ اپنا نیا کھیت دکھانے کی غرض سے جسونت کو رانا گڈھ لے گیا۔ جسونت بھی جب منوہر کے ساتھ لاجونتی کے یہاں دوپہر کے کھانے پر گیا تو لاجونتی کو دیکھ کر ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ جب وہ منوہر کے ساتھ واپس آیا تو اس کے خیالوں میں صرف لاجونتی بسی ہوئی تھی۔ راتوں کی تنہائیوں میں لاجونتی کا جوان تصور اسے گدگداتا رہا اور اس نے محسوس کیا جیسے لاجونتی کے بغیر اس کی زندگی ویران اور سپاٹ رہ جائے گی۔ ایک دن تاب نہ لاکر اس نے پیغام بھجواہی دیا۔

اپنی لڑکی کے لئے جسونت کا پیغام پاکر کشن خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے بڑے گھرانے سے خود بات آجائے گی۔ اس نے فوراً ہی پیغام منظور کرلیا۔

جب لاجونتی کو خبر ہوئی تو وہ لاج کی ماری لاجونتی خود تو احتجاج نہ کرسکی۔ زمین منوہر کے ایک خاص کارندے کو بھیج کر منوہر کو بلوایا اور ساری باتیں بتائیں۔ منوہر نے لاجونتی کو دلاسا دیا اور سمجھایا کہ جسونت کو چونکہ ہمارے پیار کا علم نہیں ہے اس لئے اس نے انجانے میں پیغام بھجوادیا ہے۔

دوسرے دن منوہر نے جسونت کو بتایا کہ وہ اور لاجونتی عرصے سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہوجانا چاہتے ہیں' اس لئے ایک اچھے دوست کی حیثیت سے ان کے راستے سے ہٹ جائے۔ منوہر کی باتیں سن کر پہلے تو جسونت نے اپنی ناواقفیت اور غلطی کا اعتراف کیا اور پھر اپنی پگڑی منوہر کے

قدموں پر رکھ کر گڑگڑانے لگا کہ وہ لاجونتی کو اسے دے دے۔ منوہر نے لاکھ اس سے لاجونتی سے دست بردار ہو جانے پر اصرار کیا، لیکن وہ نہ مانا۔ جسونت نے یہاں تک کہہ دیا کہ اب جب کہ پیغام منظور ہو چکا ہے اور بات گھر کی چہار دیواری سے نکل کر گاؤں تک پہنچ چکی ہے، وہ انکار کر کے اپنی اور کشن کی بے عزتی نہیں کرا سکتا۔ منوہر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ جسونت جس نے اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دی ہیں، جو اس کے لئے جان پر کھیل جانے کو تیار رہتا تھا آج ایک عورت کے لئے اس کے سینے میں رقابت کا تیز خنجر گاڑ دے گا۔

اب لاجونتی کو پانے کے لئے منوہر کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ کشن کو اپنا پیغام منظور کرنے پر مجبور کر دے یا پھر لاجونتی کو لے کر فرار ہو جائے۔ دوسری صورت اس کے لئے قابلِ قبول نہ تھی۔ ایسا کرنے میں گھر بار، کھیتی باڑی چھوڑنے کے علاوہ خاندان کی عزت ملیامیٹ ہو جاتی۔ کافی سوچ بچار کرنے کے بعد اس نے پیغام بھجوانا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن دوسرے ہی دن اس کا پیغام یہ کہہ کر واپس کر دیا گیا کہ اگر منوہر کی ایک شادی نہ ہو چکی ہوتی اور وہ ایک بچے کا باپ نہ ہوتا تو اس کے پیغام پر غور کیا جا سکتا تھا۔ اب ایسی صورت میں جب کہ کنواری لاجونتی کے لئے کنوارے اور اچھے گھرانے کی بات آ چکی ہے، منوہر کا رشتہ موزوں نہیں۔ منوہر نے آخری کوشش کرتے ہوئے اپنی ساری جائداد لاجونتی کے نام لکھ دینے کی پیشکش کی لیکن سب بے کار۔

یوں ایک دن وہ بھی آیا جب لاجونتی کی ڈولی بڑی دھوم دھام سے منوہر کے بجائے جسونت کے دروازے آ لگی۔

جسونت کو آج بھی ساری باتیں جوں کی توں یاد تھیں۔ اس کے قدم منوہر کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا، کاش اس نے لاجونتی کو دیکھا ہوتا، کاش اس نے منوہر کی بات مان لی ہوتی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ نادم ہونے کی گھڑی تو سترہ سال پیچھے چھوٹ گئی تھی۔

منوہر کے گھر کے احاطے میں داخل ہو کر جسونت نے دیکھا کہ ایک لمبے چوڑے

ت، جس پر قیمتی شولا پوری چادر بچھی ہوئی تھی، گاؤ تکیئے سے ٹیک لگائے اور حقہ کی نَے دانتوں میں دبائے منوہر بڑے پیار بھرے انداز میں اپنے بیٹے رام کی طرف دیکھ رہا تھا، جو تازہ اخبار کی خبریں پڑھ پڑھ کر تخت کے گرد بیٹھے ہوئے گاؤں کے جاہل اور گنوار لوگوں کو سنا رہا تھا۔ جسونت کے دل میں خیال آیا، کاش رام جیسا میرا بھی ایک بیٹا ہوتا!

جسونت کو اپنی طرف آتے دیکھ کر منوہر کو کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی کیوں کہ اس سے پہلے بھی جسونت اس کے یہاں کئی بار آچکا تھا۔ اس نے سیدھا بیٹھتے ہوئے جسونت کو بھی اپنے پاس ہی بیٹھالیا۔ مزاج پرسی کی، حقہ کی نے اس کی جانب بڑھا دی ــــ ایک طویل کش لے کر جسونت نے کہا: "سب بھگوان کی دیا ہے' ایک ضروری معاملے میں تم سے باتیں کرنی ہیں!"

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" منوہر نے دریافت کیا۔

"ہاں! لیکن یہ باتیں ہم ہی دونوں کے درمیان رہیں تو زیادہ اچھا ہے!"

"تو یہاں سے کہیں اور چلیں؟"

"نہیں، اتنی بھی کیا جلدی ہے۔" اور جسونت رام سے مخاطب ہوگیا۔ "ہاں، تو بیٹا کیا لکھا ہے آج کے اخبار میں، ذرا میں بھی تو سنوں!"

کچھ دیر تک رام انھیں اخبار پڑھ کر آج کل کے حالات بتاتا رہا۔ جب گاؤں والے چلے گئے تو منوہر نے رام کو دو گلاس لسی لانے کو کہا۔ رام کے جانے کے بعد منوہر نے جسونت سے آنے کی وجہ دریافت کی۔

جسونت سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا جیسے سوچ رہا ہو بات کہاں سے شروع کی جائے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

"منوہر، تمھیں تو ساری باتیں آج بھی یاد ہوں گی، اور تم یہ بھی نہ بھولے ہوگے کہ بچپن سے میری شادی تک ہم کتنے اچھے دوست تھے۔ لیکن لاجونتی سے میری شادی کے بعد ہمارے تعلقات میں وہ گرمجوشی نہ رہی۔ ہمارے درمیان نفرت کی دیوار حائل ہوگئی

ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں لیکن اجنبیوں کی طرح۔ اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ میں لاجونتی سے شادی کر کے تم جیسے اچھے دوست سے محروم ہو گیا ہوں۔ اور اب میں چاہتا ہوں کہ یہ دوری ختم ہو جائے اور ہم پھر اسی جگہ آجائیں جہاں آج سے سترہ سال پہلے تھے۔"

منوہر کو حیرت ہوئی کہ آج اچانک جسونت کو اس کا خیال اتنی شدت سے کیسے آگیا اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "جو باتیں آج تمہاری سمجھ میں آئی ہیں وہ اس وقت آگئی ہوتیں تو آج میری نظروں میں تم دیوتا سمان ہوتے لیکن اب پچھتانے سے کیا ہو سکتا ہے!"

"بہت کچھ ہو سکتا ہے منوہر! بہتر ہے ہم پچھلی ساری باتیں بھول جائیں ہم ہر یاد کا گلا گھونٹ کر تازہ دم ہو سکتے ہیں اور ہماری دوستی کی ویران ڈگر پھر سے آباد ہو سکتی ہے!"

منوہر نے محسوس کیا کہ جسونت کی ان خوشامدانہ باتوں کے پیچھے ضرور کوئی خاص بات ہے اس نے غور سے جسونت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

منوہر کی نظروں کی تاب نہ لا کر جسونت نے اپنی نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا۔ "آج میں دوستی کے نام پر تم سے تمہاری بہت قیمتی چیز مانگنے آیا ہوں۔" جسونت کچھ جھجکا۔ پھر کہنے لگا: "تم نے سنیتا کو تو دیکھا ہی ہے۔ کیسی لگتی ہے تمھیں؟"

"بھلا سنیتا کیسے اچھی نہ لگے گی؟ سندر، سوشیل، گن وتی!"

منوہر کے منہ سے سنیتا کی تعریف سن کر جسونت کو کچھ ڈھارس ہوئی اور اس نے فوراً بلا کسی اور تمہید کے کہا۔

"تو پھر اپنے رام کے لئے سنیتا کو قبول کر لو! بڑی اچھی جوڑی رہے گی دونوں کی!"

منوہر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جسونت اتنی آسانی سے سنیتا اور رام کے رشتے کی بات چھیڑ دے گا۔ اس نے کچھ رک کر کہا۔ "جسونت! مجھے سنیتا سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ بھی تو میری ہی بیٹی ہے لیکن شادی بیاہ کا معاملہ بڑا ہی نازک ہوتا ہے۔ کیا لاجونتی کو بھی یہ رشتہ پسند ہے؟"

"میں نے ذکر کیا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ تم یہ رشتہ پسند کرو گے لیکن اب جب وہ سنے گی کہ تم کو بھی بیٹیا پسند ہے تو وہ خوشی سے اچھل پڑے گی!"

"نہیں جسونت، رشتے کی بات اس طرح اچھی نہیں ہوتی۔ سب کی مرضی ہونی ضروری ہے پہلے تم لاجونتی سے دریافت کرو۔ اگر اس کو یہ رشتہ پسند ہے تو پھر میں بھی راضی ہوں، مجھے کوئی اعتراض نہیں!"

خوشیوں میں مگن جسونت تیز تیز قدم بڑھاتا اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ لاجونتی بھلا باولی ہے جو اس رشتے سے انکار کرے گی۔

گھر پہنچ کر جسونت نے لاجونتی کو اپنی اور منوہر کی ساری باتیں بتائیں اور کہا: "اب صرف تمھاری ہاں کی دیر ہے!"

لاجونتی خاموشی سے تمام باتیں سن رہی تھی لیکن جب جسونت نے اس کی مرضی چاہی تو وہ افسردگی سے بولی: "کیوں اپنی اور اپنے خاندان کی ناک کٹوانے پر تلے ہو، منوہر صرف تم سے بدلہ لینے کے لئے شادی پر تیار ہوا ہے۔ وہ ٹھیک بیاہ کے دن بارات لانے سے انکار کرکے تمھیں پورے گاؤں میں ذلیل کرے گا!"

لاجونتی کی باتیں جسونت کو اچھی نہ لگیں۔ اس نے لاجونتی کو ڈانٹتے ہوئے کہا: "کیوں بدشگونی کی باتیں کرتی ہو، منوہر کو تم سے زیادہ میں جانتا ہوں، وہ کبھی ایسا نہ کرے گا۔ وہ تو منوہر نے تمھاری مرضی دریافت کرنے کی شرط لگا دی ہے ورنہ میں تمھاری مرضی کا محتاج نہیں تھا۔ سب کچھ خود ہی کر لیتا!"

"میں تو تمھارے بھلے کی کہہ رہی ہوں۔ ذرا سوچو تو آخر منوہر نے میری مرضی کی شرط کیوں لگا دی ہے۔ کیا اس میں بھی اس کی کوئی چال نہیں؟" لاجونتی نے نرمی سے کہا۔

"کچھ بھی ہو۔ میں یہ سب سننا نہیں چاہتا۔ بس تم صرف ہاں کہہ دو!" جسونت نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"تمھیں جو کچھ کرنا ہے کرو۔ میں کبھی ہاں نہیں کہوں گی۔ مجھے یہ رشتہ بالکل پسند نہیں!" لاجونتی نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔

جسونت نے ہر ممکن طریقے سے لاجونتی کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن جب وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکا تو ایک دن اس نے لاجونتی کو دھمکاتے ہوئے کہا کہ اگر کل صبح تک اس نے اس رشتہ کو پسند نہ کیا تو اس کا نتیجہ بڑا ہی بھیانک ہو گا۔

لاجونتی سمجھ گئی کہ اب جسونت اس کی ایک نہ سنے گا اور اس کی مرضی حاصل کر کے رہے گا۔ وہ دن بھر ملول رہی۔ رات کو سونے سے پہلے بھی جسونت نے کہا: "کل سویرے میں منوہر کو بلا رہا ہوں۔ دیکھنا میری مرضی کے خلاف کوئی بات نہ ہو!"

لاجونتی خاموش رہی اور بغیر کچھ کہے اپنے پلنگ پر جا کر سو گئی۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ جسونت کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا لاجونتی خلاف معمول سو رہی ہے۔ اس نے سوچا ممکن ہے وہ کافی رات گئے تک سیتا اور رام کے رشتے کے بارے میں سوچتی رہی ہو اور دیر سے سونے کے باعث اب تک سو رہی ہو۔

وہ اپنے بستر سے اٹھا، ایک بھرپور انگڑائی لے کر لاجونتی کے پلنگ کے قریب آیا اور اس کا شانہ ہلا کر جگانے لگا۔ جب آہستہ آہستہ شانہ ہلانے پر وہ نہیں جاگی تو جسونت نے اسے جھنجھوڑ دیا ـــــ اور یکایک جسونت کی چیخ نکل پڑی۔

آنکھوں کے دیئے بجھ گئے تھے، گالوں کے گلاب مرجھا گئے تھے، یاقوتی ہونٹوں کی آب اتر گئی تھی۔ کندن جیسے جسم نے موت کی چادر اوڑھ لی تھی۔

لاجونتی کے دائیں شانے کے نیچے سے اس کی افیون کی ڈبیہ جھانک رہی تھی۔ کھول کر دیکھا تو نصف تولہ افیون کی جگہ کاغذ کا ایک ٹکڑا تہہ کر کے رکھا ہوا تھا۔ اس نے ڈبیہ سے کاغذ نکالا اور پھر اس کی نظریں اس ٹکڑے سے کاغذ کی آڑی ترچھی تحریر پر جم گئیں۔

"...... سیتا اور رام کی شادی کیسے ہو سکتی ہے جب کہ منوہر کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ جب میری شادی تم سے ہوئی تو سیتا دو ماہ کی میرے پیٹ میں تھی!"

کاغذ کا ٹکڑا جسونت کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کی نگاہیں بے جان لاجونتی کے چہرے پر تھیں۔ اس کی آنکھوں میں نہ تو آنسو تھے اور نہ ہونٹوں پر آہیں۔ وہ حسرت و یاس کا مجسمہ بنا محسوس کر رہا تھا جیسے سترہ سال پہلے جیتی ہوئی بازی آج اچانک اپنی تمام پونجی سمیت ہار گیا ہو!

***

معمولی بات

"۔۔۔۔۔۔ ہاں تو پارٹی کیسی رہی؟" سہیلی نے اس کے قریب ہی سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
وہ صوفے پر کچھ اور پھیل گئی اور کہنے لگی:

"بہت گرینڈ، سالگرہ کی ایسی شاندار پارٹی شاید ہی کوئی کرتا ہو۔ بڑے ہال کو رنگ برنگ کے پھولوں، ریشمی پردوں، خوشنما قالینوں، دیدہ زیب فانوسوں، فرسٹ کلاس فرنیچروں اور رنگین برقی قمقموں سے سجا کر سورگ بنا دیا گیا تھا۔ زرق برق کپڑوں میں لڑکیاں تو یوں لگ رہی تھیں جیسے اپسرائیں ہوں۔ میں بھی کسی سے کم نہ تھی۔ جاپانی بروکیٹ کی سنہری ساڑھی اور بلاؤز میں سونے کا مجسمہ لگ رہی تھی اور گلے میں نکلس تو غضب ڈھا رہا تھا۔ جو بھی دیکھتی بس دیکھتی ہی رہ جاتی۔ جس کو دیکھو میری طرف چلی آرہی ہے۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ خواہ مخواہ کی باتیں کرنا تو محض ایک بہانہ ہے، اصل مقصد تو نکلس کو نزدیک اور غور سے دیکھنا ہے!"

"کسی نے کچھ پوچھا بھی، کب لیا، کتنے میں لیا، کہاں سے لیا؟" سہیلی نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"پوچھے بنا چین کیسے پڑتا بھلا۔ شالنی کو جب بتایا کہ پورے پانچ ہزار کا ہے تو کہنے لگی، اگر چھ ہزار میں بھی ملے تو میں ابھی خرید لوں۔ شکیلہ نے اپنا نکلس دکھاتے ہوئے کہا۔ میرا نکلس چھ ہزار سے کچھ ہی کم کا ہے، لیکن جو چمک دمک تمہارے نکلس میں ہے میرے نکلس میں نہیں۔ ایک مدراسی چھوکری تھی۔ بڑی دھان پان، گہنوں سے لدی ہوئی، کہنے لگی۔ اگر کوئی میرے سارے گہنے لے کر ایسا ہی نکلس دے دے تو بھی میں خود کو نفع میں سمجھوں گی۔ اب میں یہ کیسے کہتی کہ

یہ نکلس میرا نہیں، میری سہیلی کا ہے، میں تو صرف رات بھر کے لئے مانگ کر لائی ہوں!"

"تب تو بڑا گل کھلایا میرے نکلس نے؟" نکلس کی تعریف سنکر سہیلی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی:

"یہ لڑکیاں تو رات بھر نہ سوئی ہوں گی!"

اس نے ایک لمبی اور سرد سانس لیتے ہوئے کہا۔

"سوئی ہوں گی تب بھی نکلس ہی کے سپنے آتے رہے ہوں گے۔ کئی لڑکیاں تو آج سویرے ہی سے ایسے نکلس کے لئے جیولروں کی دوکانوں کی خاک چھانتی پھر رہی ہوں گی!"

"ان بچاریوں کو کیا معلوم کہ یہ نکلس میرا ایک بوائے فرینڈ پیرس سے لایا تھا۔ ہاں تو پارٹی کب ختم ہوئی؟" وہ بھی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"قریب گیارہ بجے، لیکن جب گھر پہنچی تو پو پھٹ چکی تھی!" اس نے دونوں پاؤں فرش پر پھیلا دیئے۔

"تو رات وہیں بسر کی؟" سہیلی نے دریافت کیا۔

"نہیں!"

"تو پھر؟"

"کیا بتاؤں، عجیب مصیبت میں پھنس گئی۔ گھر جانے کے لئے باہر آئی تو ٹیکسی نہ ملی۔ سوچا گھر کچھ زیادہ دور تو ہے نہیں پیدل ہی چلی چلوں۔ ابھی کچھ ہی دور چلی تھی کہ محسوس ہوا کچھ فاصلے سے پیچھے پیچھے آنے والا وہ دراصل میرا ہی پیچھا کر رہا ہے۔ میں ڈر گئی۔ گلے میں قیمتی نکلس جو تھا میں تیز تیز قدم بڑھانے لگی۔ وہ بھی تیز تیز چلنے لگا اور جب کنگ اسٹریٹ کی طرف مڑی تو اچانک اس نے مجھے اس طرح دبوچ لیا جیسے باز کسی ننھی منی چڑیا کو دبوچ لے!"

"پھر؟" سہیلی چونک گئی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"پھر کیا، آگے پیچھے دور تک ویران اور سنسان سڑک، ایک طرف نیند اور گہری خاموشی میں ڈوبی ہوئی بلند و بالا عمارتیں اور دوسری طرف وہ کمبخت سنسان گھنا اور لمبا چوڑا پارک! میں مجبور اور بے بس ہو گئی۔ کرتی بھی کیا۔ کہاں میں ایک نرم اور ملائم ہاتھ پاؤں

والی نازک سی ایک کمزور لڑکی اور کہاں وہ ....!" وہ اطمینان سے بولی۔

"اور پھر؟" سہیلی اور بھی حیرت زدہ ہو گئی۔

"پھر تو وہی ہوا جو شملہ میں قیام کے دوران تمہارے ساتھ ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شملہ والے نے دو روز پہلے تم سے دوستی گانٹھ لی تھی اور کل رات والا میرے لئے اجنبی تھا!" اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ آنچل شانے سے ڈھلک گیا۔

"اور ...... اور وہ نکلس؟" سہیلی اس کی طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی اس طرح چونک کر بولی جیسے مزید ضبط کی تاب نہ ہو اس میں۔

وہ اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھتی ہوئی سہیلی کی طرف جھک کر بولی:

"خوشی کی بات تو یہ ہے کہ اس بدمعاش کا دھیان نکلس کی طرف گیا ہی نہیں ورنہ وہ اسے بھی اڑا لے جاتا اور میں تمہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی!" اس نے وینٹی بیگ سے نکلس نکال کر سہیلی کی طرف بڑھا دیا۔

سہیلی نے لپک کر نکلس لے لیا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا اور آئرن سیف میں بند کر کے اطمینان کی سانس لیتی ہوئی بولی:

"چور اچکوں کا کوئی بھروسہ نہیں، ہر اچھی اور قیمتی چیز سنبھال کر رکھنی چاہیے......! چلو آج شام کی چائے کسی اچھے ریستوران میں پئیں گے!"

اور وہ دونوں جوان اور خوبصورت لڑکیاں گھر سے نکل کر شہر کی گہما گہمی اور چہل پہل میں گم ہو گئیں!!

***

اپنی آگ

صبح ہو چکی تھی۔ کہرا چھٹ چکا تھا۔ برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں پر طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی سنہری کرنوں کا عکس ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا جیسے دوشیزۂ سحر کے غیر محتاط ہاتھوں سے سیندور اکھل گیا ہو اور ہر طرف سیندور ہی سیندور بکھر گیا ہو۔ پہاڑوں کے دامن میں دور تک پھیلے گھنے جنگلوں کے سلسلے دور سے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے کسی پہاڑی لڑکی نے غسل کے بعد بھیگی ہوئی کنچن ہری ساڑی پھیلا دی ہو اور جنگلوں کے دامن سے الجھتی، اٹکھیلیاں کرتی بہتی ہوئی پہاڑی ندی کا چمکتا ہوا پانی ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے کنچن ہری ساڑی پر چاندی کی گوٹ ٹنکی ہو۔

بہورانی اپنی حویلی کی کھلی چھت پر کھڑی شمال کی طرف دور مشرق سے مغرب تک پھیلے قدرتی مناظر میں کھوئی ہوئی تھیں۔ ان کی نظریں قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتی آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگیں۔ جب بہت نیچے، بہت قریب اتر آئیں تو ان کا مزاج بگڑ گیا۔ ایسا ہی معلوم ہونے لگا جیسے دل کش قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتی ہوئی ان کی نظریں اچانک کسی کریہہ منظر سے ٹکرا گئی ہوں۔ بڑبڑائیں، "اونہہ! مخمل میں ٹاٹ کا پیوند.........." وہ جھٹکے سے مڑیں اور اوپر سے نیچے اترنے لگیں۔ خود سے کہنے لگیں۔ "کیا ضرورت تھی انھیں یہاں بسانے کی؟ یہ جنگلی، یہ میلے کچیلے لوگ......"

بہورانی جس دن مادھو پور کے اس واحد زمیندار گھرانے میں بہو بن کر آئیں اس دن سے آج تک کی ساری باتیں انھیں اس طرح یاد تھیں جیسے سب کل کی باتیں ہوں اور یہ تو سارا گاؤں

جاتا تھا کہ جب آشا پیدا ہوئی تھی تو اس کے باپ رام بابو نے چھٹی کے دن بہت بڑے جشن کا انتظام و اہتمام کیا تھا۔ اپنے گاؤں کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے علاوہ قرب و جوار کے گاؤں والوں کو بھی دعوت دی تھی۔ انواع و اقسام کے کھانے پکے تھے، منوں مٹھائیاں بانٹی گئی تھیں، ناچ گانوں کی کئی محفلیں سجائی گئی تھیں ـــــ جس دن آشا کی چھٹی کا یہ جشن منایا جا رہا تھا اسی دن جنگل کے کنارے بسے کئی دھانگڑ روتے پیٹتے رام بابو کے پاس آئے۔ سارا گاؤں روتے پیٹتے دھانگڑوں کے گرد جمع ہو گیا۔ دھانگڑوں کا سردار بوڑھا منگلو رو رو کر رام بابو سے کہنے لگا۔ ہماری جانیں بچائیے سرکار۔۔! جنگلی جانور دن دہاڑے ہمارے مویشیوں کو لے جاتے تھے، اب ہمیں بھی ایک ایک کر کے اٹھائے جائیں گے۔ رات ایک چیتا میرے جوان بیٹے ہری کو لے گیا۔ ہمیں اپنی شرن میں لے لیجئے مالک! اپنے پیروں کے نیچے تھوڑی زمین دے دیجئے سرکار! رام بابو سوچنے لگے اتنے سارے لوگوں کے بیچ کیا کہیں، کیا کریں؟ کہ منگلو نے ان کا پاؤں پکڑ لیا۔ کہنے لگا۔ آج کی خوشی میں ہمیں بھی شریک کر لیجئے مالک! اپنی بچی کی جان کا صدقہ ہی دے دیجئے۔ ہم سدا آپ کی بچی کو دعائیں دیتے رہیں گے، آپ کی سیوا کرتے رہیں گے۔ بچی کے حوالے پر رام بابو کی مامتا تڑپ اٹھی، دل پسیج گیا۔ اتنے سارے لوگوں کے بیچ اپنے مان اور مریادا کا بھی خیال آیا۔ سوچا، سیکڑوں بیگھوں میں پھیلی ہوئی زمینوں میں سے تھوڑی سی زمین ان مصیبت کے ماروں کو دے دیں گے تو کون سی کمی ہو جائے گی۔ سمندر سے ایک ڈول پانی نکل جائے تو سمندر کا کیا بگڑ جائے گا، اور اس احسان کے بدلے یہ ان کی چاکری بھی تو کیا کریں گے ـــــ اور رام بابو نے انھیں تھوڑی سی زمین دے دی۔ انھیں اپنے قریب بسا لیا۔

جب یہ میلے کچیلے، غیر مہذب دھانگڑ یہاں آ کر آباد ہوئے تو برسوں ان کی حالت جوں کی توں رہی۔ رہنے کو چار تنکوں کی جھونپڑیاں، پہننے کو ڈھنگ کے کپڑے نہ کھانے کو اچھی غذائیں، اپنا رہن سہن نہ تعلیم، البتہ یہ اس حد تک انسان ضرور ثابت ہوئے تھے کہ رام بابو کے احسان کے بوجھ سے ان کی گردنیں جھکی رہتی تھیں۔ ان کی کھیتی باڑی کا بہت سارا ذمہ انھوں نے اپنے سر لے لیا تھا۔ رام بابو کے کھیتوں کو یہ اپنے خون پسینے سے

سینچتے۔ ان کے لئے ارہر اور مسور کی دال، گیہوں، باسمتی، بھرنی وغیرہ چاول پیدا کرتے اور خود دن رات کی محنت محنت اور مزدوری کے عوض دو سیر موٹا دھان، باجرا، جو یا مکئی جو بھی ملتا بخوشی لے لیتے۔ ان کو احساس ہی نہیں تھا کہ گیہوں اور باسمتی، بھرنی وغیرہ چاول پیدا کرنے والے باجرا، جو یا مکئی ہی کیوں کھاتے ہیں۔ یہی ان کی غذا کیوں ہے؟

بہو رانی مذہبی اور پرانے وچاروں اور رسم و رواج کی پابند تھیں۔ وہ ان دھانگڑوں کو انسان تو سمجھتی تھیں لیکن اس حد تک نہیں کہ انھیں تمام تر انسانی حقوق دے دیئے جائیں ان کا خیال تھا اگر ان اچھوتوں کو برابری کا درجہ دے دیا گیا تو پھر چھوٹے اور بڑے، اونچ اور نیچ میں فرق ہی کیا رہ جائے گا؟ دین دھرم، رسم و رواج سب کچھ تہس نہس ہو کر رہ جائے گا۔ پرکھوں کی مریادا خاک میں مل جائے گی۔

جب آشا چھوٹی تھی۔ کھیلتے کھیلتے گھر سے باہر نکل جایا کرتی تھی تو وہ اسے تاکید کیا کرتی تھیں۔ 'بیٹی، دھانگڑوں کی طرف مت جانا' ـــــــ برابر ایک ہی ہدایت سنتے ایک دن آشا کے ناپختہ ذہن نے سوچا 'آخر ہے کیا اس طرف؟ اور جب وہ باہر سے کھیل کود کر آئی تو کہنے لگی۔ 'ماں! جدھر تم جانے سے منع کرتی تھیں نا ادھر تو بہت ہی اچھے اچھے بچے ہیں رامو، شیامو، منو، بسنتی، رانو۔ سب نہال ہو گئے مجھے دیکھ کر۔ بہت دیر تک کھیلتی رہی ان کے ساتھ!' پھر تو آشا کی معصوم آنکھیں حیرت سے بہو رانی کو تکتی رہیں اور بہو رانی ہیجھتی رہیں کمبخت گئی کیوں ادھر؟ میں نے تو منع کیا تھا نا۔ سور اچھوتوں سے سر پر چھوا کر آئی ہے! اور شام کی خنکی کا خیال کئے بغیر بہو رانی نے اسے صابن سے مل مل کر نہلایا تھا۔ کپڑے بدلے تھے اور آشا روتی رہی تھی ـــــــ اور پھر ایسا آئے دن ہونے لگا تھا۔ آشا دھانگڑوں کے یہاں جاتی رہی تھی، ان کے بچوں کے ساتھ کھیلتی رہی تھی اور بہو رانی کی ڈانٹ سنتی رہی تھی اور وقت دبے پاؤں گزرتا رہا تھا۔

بہو رانی آشا کی پرورش و تربیت اسی ڈھنگ سے کرنا چاہتی تھیں جس ڈھنگ سے ان کی ماں نے ان کی پرورش و تربیت کی تھی لیکن انھیں اپنی کوششیں بار آور ہوتی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ جب تک آشا ان کی گود میں ہمکتی رہی، باہنوں کے حصار میں مچلتی رہی گھر

کے آنگن تک کلیلیں کرتی رہی، سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق ہوتا رہا لیکن جب وہ بہو رانی کی گود سے، باہوں کے حصار سے اور گھر کے آنگن سے نکل کر کھیتوں، کھلیانوں اور باغوں میں آئی، کھلی ہوا میں پرواز کرنے اور سانس لینے لگی تو معلوم ہونے لگا جیسے وہ گزرتا ہوا وقت ہو جسے مٹھی میں بند نہیں کیا جا سکتا، بہتی ہوئی شوخ و چنچل ندی ہو جس کے آگے کوئی بند بیکار ہو، ہوا ہو، قید و بند سے آزاد ——— اور جب شعور بالیدگی کی طرف رواں ہوا، ذہن کی کھڑکیاں ایک کے بعد ایک کھلنے لگیں، دماغ روشن ہونے لگا تو اس کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت بھی نئے انداز سے انگڑائی لینے لگی۔

آشا اپنے بالائی کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ بہو رانی کی زور زور سے بولنے کی آوازیں سن کر اٹھی۔ کمرے سے نکل کر نیچے آنگن میں آئی۔ دیکھا بہو رانی بسنتی پر بگڑ رہی تھیں دریافت کیا تو معلوم ہوا آنگن میں جھاڑو لگاتے ہوئے بانس کی چنگیر میں رکھے پرانے باسمتی چاول کو بسنتی نے ہاتھ لگا دیا ہے اور اب جرم کی سزا کے طور پر بہو رانی کا عتاب بسنتی پر نازل ہو رہا تھا۔ بسنتی پر برستے بولتے۔ بہو رانی کا چہرا لال بھبھوکا ہو گیا تھا اور بسنتی خاموش کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آشا سے بسنتی کا یوں کانپنا دیکھا نہ گیا۔ آگے بڑھی۔ بہو رانی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"جانے دو ماں، بسنتی نے چھوا ہی تو ہے، کوئی گندی چیز تو نہیں ڈال دی چاول میں!"

بہو رانی نے آشا کو جھڑک دیا۔ "دور ہٹ، تو تو پہلے ہی ان کے ساتھ اٹھ بیٹھ کر اپنا دھرم نشٹ کر چکی ہے، اب چاہتی ہے میں بھی اپنا سب کچھ گنوا دوں؟" آشا خاموش ہو گئی تو وہ چنگیر کو ٹھوکر لگاتے ہوئے بولیں۔ "جنم جلی، اٹھا اور لے جا یہ چاول۔ اب تو یہ ہمارے کام کا نہ رہا۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں تمھیں مفت دے رہی ہوں۔ دو مہینے کی تنخواہ دس روپے کاٹ لوں گی!"

بسنتی چاول لے گئی تو آشا مسکراتے ہوئے بولی۔ چلو اچھا ہوا۔ اسی بہانے پرانے باسمتی کا بھات تو کھائیں گے بسنتی کے گھر والے۔ پر ماں تمھیں اس کی تنخواہ

نہیں کاٹنی چاہیے۔ تم نے اسے چاول اپنی مرضی سے دی ہے نا اس لیے!"

"ابے چپ، بڑی آئی بسنتی کی طرفدار!" اسے بھی ڈانٹ سننی پڑی۔

لیکن جیسے آج آشا ڈانٹ سننے کے موڈ میں تھی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ماں، بوائی سے لے کر کٹائی اور دنوائی تک ہماری فصلیں انھیں اچھوتوں کے ہاتھوں سے گزرتی ہیں، انھیں کے ہاتھوں ہماری بکھاریوں میں رکھی جاتی ہیں اور انھیں اناجوں کو یہ ہمارے آنگن میں ہاتھ لگا دیں تو یہ اناج اشدھ ہو جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ماں؟"

بھورانی سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو ایک دھول آشا کی پشت پر لگا کر بولیں۔ "بھاگ یہاں سے۔ اب تو مجھے تیرے ہاتھ کے چھوئے سے بھی پرہیز کرنا پڑے گا۔"

آشا ہنستی، تیز تیز قدم بڑھاتی گھر سے باہر نکل گئی۔ وہ اسے جاتے دیکھتی رہیں۔ جانتی تھیں یہ سیدھی رانو کے یہاں جائے گی۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ جب آشا نے ہوش سنبھالا اور اسے جب یہ معلوم ہوا کہ رانو دو ماہ کی تھی تو اس کے باپ کو چیتا اٹھالے گیا تھا تو اس وقت سے ہی آشا کو رانو پر ترس آنے لگا تھا، اسے رانو سے ہمدردی ہو گئی تھی اور یہ ہمدردی رفتہ رفتہ دوستی میں بدل گئی تھی۔ بھورانی برابر کوششیں کرتی رہیں کہ آشا رانو سے نہ ملا کرے، اسکے یہاں نہ جایا کرے لیکن وہ ہمیشہ اپنی کوششوں میں ناکام رہیں۔ آشا کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ کب کی اس سے قطع تعلق کر چکی ہوتیں لیکن وہ تو مجبور تھیں اپنی مامتا سے۔ اکلوتی بچی کی محبت نے انھیں، سب کچھ سہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ایک شام ——— بھورانی کھلی چھت پر گئیں تو آشا کو شمال کی طرف دیکھتے پایا۔ بولیں۔ "چل ناشتہ کر لے۔ کیا دیکھ رہی ہے ادھر ——؟"

آشا نے کہا۔ "تو بھی دیکھ ماں، وہ برف سے ڈھکے پہاڑ، دور تک پھیلے جنگلوں کے سلسلے، وہ شوخ و چنچل ندی اور یہ ہر طرف لہلہاتے گیہوں اور سرسوں کے ہرے پیلے کھیت!"

بھورانی تنک کر بولیں۔ "اے تو کونسی نئی چیزیں ہیں یہ۔ روز ہی تو دیکھا کرتی ہے یہ سب!"

آشا مسکرائی، بولی۔ "ماں! میں تو جب بھی دیکھتی ہوں یہ سب مجھے نئے لگتے ہیں!" اسی وقت جنگلی لکڑیوں سے بھرا ایک ٹرک تیزی سے سامنے سے گزر گیا۔ آشا کہنے لگی۔ "دیکھا ماں،

ایک چٹکی بھی گرد نہیں اڑی۔ کل تک کتنی خراب تھی یہ سڑک۔ ادھڑ کھابڑ، کچی، گرد سے اٹی ہوئی اور اب جنگل کے کنارے سے شہر تک کولتار کی ہوگئی ہے۔ کل تک ہمارے کھیت پیاسے تھے، اب ہر طرف نہروں کا جال ہے۔ کل گاؤں میں پرائمری اسکول بھی نہ تھا، آج ہائی اسکول ہے۔ کل تک جوان پڑھتے تھے آج تعلیم پا رہے ہیں۔ کل تک جو صرف دوسرے کے کھیتوں سے فصلیں اگاتے تھے آج اپنے کھیتوں سے اپنی فصلیں کاٹتے ہیں۔ اچھا کھاتے ہیں، اچھا پہنتے ہیں اور ماں، کل تک وہاں چار چار تنکوں کی جھونپڑیاں تھیں اور آج ان جھونپڑیوں کی جگہ پختہ کھپریل مکانوں نے لے لی ہیں۔ کل تک ان مکانوں میں ارنڈی کے تیل کے دیئے جلتے تھے اور اب بجلی کی روشنی ہوتی ہے۔ کتنی ترقی کی ہے ہمارے گاؤں نے ماں!"

بہو رانی چڑ گئیں، پیچ و تاب کھاتی ہوئی بولیں۔ "تجھ پر تو جادو ٹونا کر دیا ہے ان دھاگڑوں نے۔ پاؤں کی جوتی سر پر آ رہی ہے اور تو اسے ترقی کہتی ہے۔"

آشا ہنسنے لگی، ہنستے ہنستے بولی۔ "پاؤں کی جوتی تو پاؤں میں ہی رہے گی ماں، البتہ سر کی ٹوپی اب پیروں سے نہ مسلی جائے گی۔ اونچ نیچ کی بنیاد پر دو انسانوں کے بیچ صدیوں سے کھڑی نفرت کی دیوار اب گر رہی ہے ماں!"

بہو رانی تلملا گئیں۔ ہاتھ اٹھا کر آشا کی طرف بڑھیں تو وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ بہو رانی چیخیں۔ "خبردار جو ان اچھوتوں کی طرف گئیں، رانو سے ملیں!"

بھاگتی ہوئی آشا رک گئی۔ پلٹ کر بولی۔ "تم ان سے صرف نفرت کرتی رہی ہو نا ماں۔ اس لئے وہ تمھیں اچھے نہیں لگتے۔ پیار کی نظروں سے دیکھو گی تو وہ تمھیں بھی اچھے لگیں گے۔ رانو بھی تمھیں اپنی ہی بیٹی نظر آئے گی!" اور وہ پھر بھاگ کھڑی ہوئی۔

بہو رانی بھاگتی ہوئی آشا کو دیکھتی رہیں اور سوچتی رہیں۔ "کہاں جا رہی ہے یہ؟ کہاں رکیں گے اس کے قدم؟ —— کہاں؟"

آشا کے سوچنے کا ڈھنگ، اس کی بہکی بہکی باتیں اکثر بہو رانی کو مضطرب کر دیتی تھیں۔ وہ سوچنے لگتیں۔ کس راستے پر جا رہی ہے یہ؟ کیا کرے گی یہ لڑکی؟ اور جب کبھی دماغ کی تنی ہوئی رگیں ڈھیلی ہوتیں تو انھیں آشا کی بہکی بہکی باتوں میں سچائی کی جھلک سی نظر آنے

لگتی۔ سوچنے لگتیں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہی کہتی ہے آشا، کل تک جو جھونپڑیوں میں رہا کرتے تھے اب اینٹ اور گارے کے بنے مکانوں میں رہ رہے ہیں۔ دوسروں کے کھیتوں میں مزدوری کرنے والے آج کھیتوں کے مالک ہیں۔ کل تک جو جنگلی، اجڈ اور گنوار تھے اب سلیقہ سے جینے اور اچھی زندگی گزارنے کے طور طریقوں سے واقف ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ——— یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم انھیں برابری کا درجہ دے دیں! اور بھورانی کی ذہنی رَو بہک جاتی۔

کڑاکے کی سردی اور کئی دنوں کی بدلی کے بعد آج آسمان صاف تھا۔ ڈھیروں دھوپ آنگن میں اتر آئی تھی۔ بھورانی آنگن کے وسط میں تخت پر بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں۔ قریب ہی بیٹھی آشا اپنے گھنے اور دراز بالوں میں تیل ڈال رہی تھی۔ بھورانی اسے دیکھ رہی تھیں، زیرِ لب مسکرا رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ کل تک یہ میری گود میں ہمکتی تھی۔ آج کھیتوں، کھلیانوں اور باغوں میں کلیلیں کرتی پھرتی ہے۔ کتنی جلدی بڑی ہو گئی یہ، کتنے جلد نکل آئے اس کے ہاتھ پاؤں، کتنا نکھر آیا ہے اس کا رنگ روپ۔ اٹھارہ برس پلک جھپکتے بیت گئے۔ اب اور کتنے دنوں رہے گی یہ اس گھر میں! ان کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ جی چاہا آشا کو کھینچ کر سینے سے لگالیں۔ اسی لمحہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ بھورانی نے مڑ کر دیکھا۔ رانو آ رہی تھی۔ دھانی رنگ کی صاف ستھری ساڑی باندھے، سر پر آنچل جمائے، دونوں ہاتھوں میں پھول کی چم چم چمکتی ہوئی تھالی سنبھالے۔ وہ آنکھوں کی نمی آنچل سے خشک کرتے ہوئے بولیں: "کیا ہے رانو؟"

رانو انھیں دیکھ کر جھجکی، کچھ ٹھٹکی، اور اپنے آپ میں سمٹی چھوٹے چھوٹے قدموں سے آگے بڑھنے لگی۔ رانو کو دیکھ کر آشا دراز بالوں کو پشت پر ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی۔ "آؤ رانو، کیا لائی ہو میرے لئے؟" اس نے آگے بڑھ کر تھالی رانو کے ہاتھوں سے لے لی خوش ہو کر بولی۔ "مکئی کی روٹیاں اور سرسوں کا ساگ!" اس نے تھالی ناک کے قریب کر کے لمبی سانس لی۔ "واہ! کتنی اچھی مہک ہے، سوندھی سوندھی!" اور وہ بھورانی کی طرف مڑ گئی "دیکھ ماں کیا لائی ہے رانو میرے لئے!"

بہورانی تلملا گئیں۔ بولیں۔ "حد ہوگئی اب تو۔ ان کے گھر جاکر تو کھاپی لیا کرتی تھی تو اب اس گھر میں بھی آنے لگا ان کے ہاتھوں کا پکا!"

آشا، بہورانی کے کہے کی پروا کئے بغیر آگے بڑھی۔ تھالی تخت پر رکھ کر مکئی کی روٹیوں سے ایک ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا اور کھانے لگی۔ بہورانی چراغ پا ہوگئیں۔ سر دیا پٹینک کر چیخیں۔ "ابھاگن! کیوں نسٹ کر رہی ہے اپنا سب کچھ! ذات پات اور پرکھوں کے راستے سے ہٹ کر کدھر جا رہی ہے تو؟"

آشا اپنی عادت کے مطابق ہنستے ہنستے بولی۔ "کب تک مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی رہوگی ماں؟ آگے اُس دِشا کی اور بھی تو دیکھو جہاں ایک نیا سورج ابھر رہا ہے، ایک نئی دنیا آباد ہو رہی ہے!"

غصے میں لال ہوتی ہوئی بہورانی نے کچھ بولنے کے لئے مُنہ کھولا ہی تھا کہ آشا نے جھٹ روٹی کا ایک ٹکڑا ان کے مُنہ میں ڈال دیا اور پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ "سوری کے بیر ہی سمجھ کر کھالے ماں!" اور وہ رانو کا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف بھاگتی چلی گئی۔

بہورانی نے روٹی کا ٹکڑا زمین پر تھوک دیا۔ غصے سے تنی سُرخ سُرخ آنکھوں سے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بھاگتی ہوئی آشا اور رانو کو دیکھنے لگیں۔ دونوں نظروں سے اوجھل ہوگئیں تب بھی وہ اسی سمت دیکھتی رہیں ——— چند لمحوں بعد انھوں نے نظریں نیچی کیں تو ان کی نظر تھوکے ہوئے نوالے پر پڑی۔ پھر انھوں نے سامنے دیکھا۔ چم چم چمکتی تھالی میں رکھی مکئی کی گرم گرم روٹیوں سے سوندھی سوندھی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہ تڑپ اٹھیں۔ انھیں محسوس ہونے لگا جیسے سوندھی سوندھی خوشگوار مہک کا دائرہ ان کے گرد وسیع اور وسیع تر ہوتا جا رہا ہو!!

***

ہمالیہ سے اونچا

..... وہ محسوس کر رہا تھا جیسے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ہو۔ کسی غیر مرئی طاقت نے اس کی ساری قوت سلب کر لی ہو ـــــ وہ پلنگ پر چیت پڑا تھا۔ دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ پاؤں پلنگ سے نیچے لٹک رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ لمبی لمبی سانسیں ذہنی انتشار کا پتہ دے رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ جانا چاہتا تھا۔ ایک بار پھر سرگرم عمل ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن تھکن کا یہ احساس! یہ تساہلی!

پچھلے کئی ہفتوں سے وہ بہت مصروف تھا۔ روز و شب کی سخت محنت کے باوجود تھکن کا احساس تک نہ ہوا تھا۔ اسے تو بس ایک ہی فکر تھی کہیں کوئی کسر نہ رہے، کوئی کمی نہ رہے۔ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے 'باپ ہوتے تو یہ کرتے' وہ کرتے۔ بھائی نے یہ نہیں کیا' وہ نہیں کیا۔ گھر میں آنے والی ہر نئی چیز کو دیکھ کر ماں کہتیں۔ اب بس کر بیٹے' اچھا اچھا آ چکا دبی بہت ہے اور وہ مسکراتے ہوئے کہتا۔ نہیں امی' پوری کر لینے دیجئے مجھے اپنی ہر خواہش' ایک ہی تو بہن ہے۔ اتنا شاندار انتظام کر دوں گا کہ لوگ برسوں یاد رکھیں گے اس شادی کو! اس نے جو کہا تھا وہ کیا تھا۔ سارے انتظامات مکمل کر لئے تھے اس نے۔ شادی کی شاندار تیاریوں میں اسے سرگرداں دیکھ کر کتنے ہی رشتہ داروں اور دوستوں نے ٹوکا تھا۔ 'امی بھی جلدی کیا؟ رشتہ تو طے ہو ہی چکا ہے' کچھ دنوں اور ٹھہر جاتے۔ حالات معمول پر آ جاتے پھر ـــــ اور وہ مضطرب ہو جاتا تھا 'کب تک آئیں گے حالات معمول پر؟ فساد ہوئے کئی ماہ ہو گئے' اور اب تک بستی پر خوف و ہراس چھایا ہوا ہے۔ ہر چہرہ سہما سہما سا' اجنبی اجنبی سا لگتا ہے۔ لوٹی ہوئی دکانیں سلگ رہی ہیں۔

منہدم اور جلے ہوئے مکانات مرمت ہو کر آباد ہو گئے ہیں، راستوں پر آمد و رفت کا سلسلہ کب کا شروع ہو چکا ہے۔ پھر بھی ہر ذہن پر خوف سا طاری ہے، ہر طرف پُر ہول سناٹا ہیبت ناک خاموشی سی طاری ہے۔ آخر کب دور ہو گا یہ خوف؟ کب مٹے گی یہ ہیبت ناک خاموشی؟ گزرے ہوئے دنوں کا ماتم کرنے سے؟ شب و روز ٹولیوں کی شکل میں فساد کا تذکرہ کرتے سے؟ ایک دوسرے کیلئے دلوں میں نفرت پالنے سے؟ سرِ شام گھروں میں بند ہو جانے سے؟ کب؟؟ اور جب اسے کوئی جواب نہ ملتا تو خود کہنے لگتا مہینوں ہو گئے بستی میں کوئی تقریب نہیں ہوئی۔ نہ ڈھول بجے نہ تاشے۔ نہ کوئی چہل پہل نہ کہیں زندگی کے آثار۔ بستی میں کوئی بارات آئی نہ کہیں بستی سے باہر گئی۔ ہر طرف گھٹن کا سا ماحول طاری ہے۔ دم گھٹ رہا ہے ہر آدمی کا۔ مہینوں گزر گئے خوشی کا ایک لمحہ میسر نہیں آیا کسی کو۔ اور کب تک رہیں گے ایسے حالات؟ اور میں حالات کو معمول پر لانے کی پہل کر رہا ہوں۔ اس پرہول سناٹے اور ہیبت ناک خاموشی کو توڑنا چاہتا ہوں۔ اپنی بہن کی شادی خوب دھوم دھام سے کرنا چاہتا ہوں۔ شادی کے جشن میں، باجوں گاجوں کے شور شرابوں میں، پُر مسرت ہنگاموں میں پوری بستی کو شریک کر لینا چاہتا ہوں، ایک جگہ سمیٹ لینا چاہتا ہوں، تاکہ سارے لوگ پُر مسرت ہنگاموں میں ڈوب کر ماضی کی روح فرسا یادوں کو بھول جائیں، سب کچھ بھول کر خوشگوار مستقبل کی طرف رواں ہو جائیں ——!

اور اسے ٹوکنے والا اس طرح خاموش ہو جاتا جیسے اب کہنے کو کچھ نہ رہا ہو اس کے پاس۔

آج شام کو بارات آنے والی ہے۔ اپنی بہن راشدہ کے لئے اس نے پرویز کا انتخاب کیا ہے۔ پرویز اس کا دوست ہے۔ خوبرو اور ذہین ہے۔ پبلک سروس کمیشن کے مقابلے میں کامیاب ہو کر ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہے۔ لینے دینے کی کوئی بات نہیں۔ حالانکہ پرویز جیسے لڑکے لاکھوں میں تلتے ہیں۔

صبح سے ہی وہ باہر کے انتظامات میں لگا ہوا تھا۔ ناولٹی الیکٹرک والوں کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ پوری عمارت کو اور پائیں باغ کے پیڑ پودوں کو رنگین برقی قمقموں سے اس طرح سجا دیں کہ شب کی تاریکی میں پوری عمارت رنگ و نور میں ڈوب جائے۔ شہنائی

اور بینڈ باجے والوں کو یہ ہدایت تھی کہ وہ ایسی ایسی دھنیں بجائیں کہ سننے والے فرطِ مسرت سے ناچنے لگیں۔ باورچیوں اور حلوائیوں کو یہ ہدایت تھی کہ وہ انواع و اقسام کے کھانے اور مٹھائیاں اتنی لذیذ بنائیں کہ کھانے والے برسوں مزہ یاد رکھیں۔ مزدوروں کو یہ تاکید تھی کہ کہیں ایک تنکا، ایک چٹکی گرد بھی نہ رہے اور منتظمین اس امر پر مستعد کئے گئے تھے کہ ہر آنے والے کا پرجوش خیر مقدم کیا جائے، فراخدلانہ تواضع کی جائے۔ وہ باہری کاموں کو متعلقہ افراد کے سپرد کر کے گھر کے اندر آیا تھا۔ اور گھر کے اندر اوپر سے نیچے تک، نیچے سے اوپر تک ایک ایک کمرے، ایک ایک کونے اور ایک ایک چیز کا جائزہ لیتا پھر رہا تھا کہیں کوئی کمی تو نہیں؟ ہر چیز اپنی جگہ سلیقے اور قاعدے سے تو ہے؟ وہ ادھر سے ادھر چکر لگاتا رہا اور ڈھولک کی تھاپ پر گائے جانے والے سہاگ کے رسیلے گیت فضا میں رچی بسی خوشبو کی طرح اس کا تعاقب کرتے رہے۔ وہ مسکراتا رہا، خوش رہا —— آج وہ بہت خوش تھا کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری اس کے سر سے اتر جائے گی۔ اس کے شانے بارِ گراں سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ اس خوشی کے ساتھ ایک غم بھی تھا جو گاہے گاہے دل کو کچوکے لگا جاتا تھا۔ کل میری بہن اس گھر سے چلی جائے گی، مجھے افسردہ اور ماں کو روتا چھوڑ کر! لیکن سوچ کا یہ لمحہ طویل نہ ہو پاتا۔ خوشی پھر اس غم انگیز خیال پر غالب آجاتی۔

وہ مختلف کمروں اور برآمدوں سے گزرتا، گھر میں بھرے ہوئے مقامی اور بیرونی مہمانوں سے ان کی ضرورتیں اور مزاج پوچھتا راشدہ کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رس میں ڈوبے سہاگ کے گیت کا ایک ایک لفظ اس کے کانوں میں شہد کی بوند کی طرح قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ جب وہ راشدہ کے کمرے کے سامنے آیا تو اس کے قدم ٹھٹھک گئے نگاہیں کھلے ہوئے دروازے سے گزر کر کمرے میں پھیل گئیں۔ شرم و حیا سے سکڑی سمٹی راشدہ فرش پر بیٹھی تھی۔ دو لڑکیاں اس کے ہاتھ پاؤں میں مہندی رچا رہی تھیں اور زرق برق لباسوں میں ملبوس کتنی ہی لڑکیاں اس کے گرد گھیرا ڈالے بڑی پُر ترنم آوازوں میں سہاگ کا گیت گانے میں مگن تھیں۔ کتنا حسین و خوشگوار تھا یہ منظر۔ لڑکیوں پر سے پھسلتی ہوئی اس کی نظر ایک گوشے پر پڑی تو وہ چونک گیا۔ لب تھرتھرائے —— انجم! اس نے محسوس

کیا یہ چہرہ اس پھول کا چہرہ نہیں جو کبھی شگفتہ و شاداب تھا۔ اسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس شگفتہ پھول کو مسل دیا ہو، ساری شگفتگی اور شادابی کشید کرلی ہو رخساروں پہ شفق کی ضیا بار سرخی نہ ہونٹوں پر مچلتی ہوئی تبسم کی حسین کرنیں۔ پیشانی پر لہراتا ہوا شباب کا پر وقار پرچم نہ آنکھوں میں زندگی سے بھرپور چمک۔ وہ تمام لڑکیوں سے الگ اداس مضمحل اور سرنگوں بیٹھی تھی۔ نہ کوئی آرائش نہ کوئی زیبائش۔ بوسیدہ کپڑوں کی گٹھری سی بنی ـــ اس کے اندر دور تک درد کی لہریں بکھر گئیں۔ قدم لڑکھڑائے، سنبھلنے کی کوشش کی اور تیز تیز قدم بڑھاتا اپنے کمرے کی طرف جانے لگا ــــــ اور اب وہ اپنے پلنگ پر چت پڑا تھا ــــــ!

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا بیٹے؟"

سوچ کے سمندر میں آواز نے لفظوں کے پتھر پھینکے تو سوچ کا شیرازہ منتشر ہوگیا آنکھیں کھول دیں۔ ہاتھوں کو سمیٹا اور اٹھ بیٹھا۔ سامنے ماں کھڑی تھیں۔

"ٹھیک ہوں امی ـ! بس یوں ہی لیٹ گیا تھا!"

"صبح سے تم نے کچھ کھایا نہیں، چلو کھالو!"

وہ ماں کے پیچھے چل پڑا۔

گھر میں اوپر سے نیچے ہر طرف چہل پہل تھی۔ وہ نیچے مغربی دالان میں تخت پر بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا کہ سامنے سے رضیہ چچی کو آتے دیکھا۔ وہ قریب آئیں تو اسے ان کے جھریوں والے چہرے پر فکر و تردد کی لکیریں کچھ زیادہ نمایاں نظر آئیں۔ کچھ اور قریب آئیں تب اسے معلوم ہوا وہ تنہا نہیں ہیں ان کے پیچھے انجم بھی ہے۔ اداس، مضمحل، سرنگوں۔ دونوں اپنے اپنے سیاہ برقعے سنبھالے ہوئی تھیں۔ اس نے ان کا راستہ روک لیا۔

"چچی جان، کہاں جارہی ہیں آپ؟"

"گھر جارہی ہوں بیٹا!" ان کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔

"کیوں ـ؟" وہ انھیں حیرت سے تکنے لگا

"اس لئے .... اس لئے کہ .... بس یوں ہی!" وہ کچھ کہتے کہتے رہ گئیں۔

وہ سمجھ گیا یہ کچھ چھپا رہی ہیں۔ بضد ہو گیا۔ "مجھے بتایئے کیا ہوا؟ کیوں جا رہی ہیں؟" اس نے دیکھا رضیہ چچی کے ہونٹ ہی نہیں پورا جسم کانپ رہا تھا۔

وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں بولیں۔

"اس لئے کہ یہاں ہماری موجودگی کسی کو پسند نہیں!" رضیہ چچی کا گلا رندھ گیا آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا

"کس نے کیا کہا ہے آپ کو؟"

"کس کس کا نام لوں، سبھی کہتی ہیں!" آنسو ان کے جھریوں والے رخساروں پر ڈھلک گئے۔

"کیا کہتی ہیں سب؟" اس نے دریافت کیا۔

رضیہ چچی نظریں نیچی کرتے ہوئے بولیں۔

"کتنی ہی عورتیں تمھاری ماں سے کہہ چکیں "کیوں بلایا ان ماں بیٹی کو، شریفوں کے گھر ان کا کیا کام!"

وہ مضطرب ہو گیا۔ کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ رضیہ چچی انجم کی طرف مڑ کر بولیں۔

"بیٹے، میرا کیا، میں تو چراغ سحری ہوں، آج مری کل دوسرا دن۔ ہر ذلت ہر رسوائی سہہ لوں گی۔ لیکن اب تو یہ دکھ کھائے جا رہا ہے مجھے کہ یہ پہاڑ جیسی زندگی لے کر کہاں جائے گی؟ کب تک جھیلتی رہے گی زمانے کے دکھ، کب تک سہتی رہے گی دنیا کے طنز و طعنے؟ کچھ ہی دیر پہلے یہ راشدہ کے کمرے میں تھی۔ لڑکیاں گا بجا رہی تھیں۔ تمھاری کانپور والی بجمہ خالہ گئیں۔ اسے اٹھا کر باہر لے آئیں۔ کہنے لگیں۔ 'ابھاگن، تو کیا کر رہی ہے ان شریف زادیوں میں؟ بھاگ یہاں سے۔ اپنا کالا منہ لے کر بیٹھ کسی اندھیرے کونے میں!'

اس نے رضیہ چچی کے پیچھے سرنگوں انجم کو دیکھا۔ لرزتی کانپتی انجم کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک ٹپک کر سیاہ برقعے میں جذب ہو رہے تھے۔ اس کا دل و دماغ سلگنے لگا۔ جی چاہنے لگا رضیہ چچی اور انجم کو حقیر سمجھنے والوں کو ابھی گھر سے نکال دے۔

لیکن آج کا دن اسے صبر و ضبط پر مجبور کر رہا تھا۔ اس نے رضیہ چچی کا ہاتھ تھام لیا۔

"امی نے بھی کچھ کہا ہے آپ کو؟ انجم کو؟"

"نہیں بیٹے، تمھاری ماں تو فرشتہ ہے۔ اس جیسی عورت تو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گی!"

وہ کہنے لگا۔"چچی جان! جہاں بہت سارے دُکھ جھیل رہی ہیں آپ وہاں آج کا یہ دکھ بھی جھیل جایئے۔ آج کا یہ زہر بھی پی لیجئے میری خاطر، راشدہ کی خاطر!"

اور وہ انجم سے بھی مخاطب ہوا۔" انجم، مجھے تمھارے غموں کا احساس ہے۔ پھر بھی تم سے میری یہ التجا ہے سب کچھ سن لو، سب کچھ سہہ لو!"

وہ رضیہ چچی اور انجم کو لے کر اپنے کمرے میں آیا اور کہا۔" یہ میرا کمرہ ہے۔ کوئی نہیں آئے گا یہاں۔ یہیں رہیں آپ!" اس نے انجم کو دیکھا۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آبدیدہ آنکھوں سے۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور جھک گئیں۔ وہ سوچنے لگا۔ کتنی اداسی، کتنی بے بسی اور محرومی ہے ان آنکھوں میں؟ وہ زیادہ دیر تک ان کے قریب نہ ٹھہر سکا اور کمرے سے باہر آگیا۔

وہ خود کو مصروفیتوں کے جال میں الجھائے رہا۔ شام کو مقررہ وقت پر بارات آئی۔ بلا امتیاز بستی کے ہر فرد نے بارات کا پر جوش استقبال کیا۔ ہر چہرہ بشاش نظر آرہا تھا۔ اس نے مسند نشین پر احباب کے درمیان گھیرے نوشہ کو دیکھا۔ ستاروں کے جھرمٹ میں تنہا چاند جیسا۔ سہرے کی لڑیوں سے جھانکتے ہوئے مردانہ حسن نے اس کے اندر مسرتوں کی کتنی ہی قندیلیں روشن کردیں۔

شادی کے اس جشن میں اس کے مقصد اور خواہش کے مطابق بستی کا ہر فرد بلا تفریق مذہب و ملت شریک تھا۔ کسی بھی چہرے پر ماضی کی کربناک یادوں کا ہلکا سا سایہ بھی نہ تھا۔ ہر چہرہ کھلا ہوا، ہر فرد مسکراتا ہوا، ہنستا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس جشن کے سہارے بستی کے سارے لوگ ایک دوسرے کے اتنا قریب آگئے تھے کہ دوری کا احساس تک مٹ گیا تھا۔ سیاہ ماضی کی کربناک یادیں حال کے پر مسرت اجالوں میں

کھو گئی تھیں۔ دو انسانوں کے درمیان جہنیوں سے حائل نفرت و تعصب کی دیوار گر گئی تھی لیکن —— ہر مسکراتے ہوئے چہرے کے پس منظر سے ایک اداس اور مضمحل چہرہ ابھر کر اسے بے چین کر دیتا تھا۔ ایک نام اس کے ہونٹوں پر ٹھہرا کر رہ جاتا تھا —— انجم —— ان ہنستے مسکراتے چہروں پر برص کا ایک داغ —— !

راما کانت ٹھاکر اس طرح باراتیوں کی خاطر تواضع میں منہمک تھے جیسے ان کے دروازے پر ان کی بیٹی رما کی بارات آئی ہو۔ مہیش پرشاد اور شکلا جی' نیاز الدین اور انوار احمد کے شانہ بہ شانہ اس طرح کاموں میں جٹے ہوئے تھے جیسے ان کی اپنی بہن کی شادی ہو۔ اختر اور اسلم پریم کمار اور دنیش سنگھ کے ساتھ اس طرح مستعدی سے مہمانوں تک شربت اور چائے پہنچا رہے تھے جیسے مہمانوں کی تواضع میں بستی کے وقار کا سوال مضمر ہو —— کہیں کوئی دوری نہیں تھی۔ کوئی فاصلہ نہ تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ خوش ہو رہا تھا۔

رفتہ رفتہ شادی کے ہنگامے سرد ہونے لگے۔ پھر وہ گھڑی بھی آئی کہ روتی بلکتی راشدہ سسکتی ہوئی ماں اور روتے ہوئے بھائی سے گلے مل کر رخصت ہو گئی۔ اپنے گھر چلی گئی —— دور سے آئے قریبی مہمانوں اور رشتہ داروں کے علاوہ باقی مہمان بھی رخصت ہو گئے

شادی کے تیسرے دن ——

اندرونی بڑے ہال میں سارے مہمان موجود تھے۔ مرد' عورتیں' لڑکے' لڑکیاں سب گفتگو کا موضوع اس بڑے گھر کے واحد چشم و چراغ کی شادی تھا۔ جوان لڑکیاں سانسیں روکے' دم سادھے بڑوں کی باتیں سن رہی تھیں۔ ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی مقابلے میں شریک ہوئی ہوں اور اب اپنی اپنی جگہوں پر بظاہر خاموش مگر اندرونی طور پر مضطرب بیٹھی اس بات کی منتظر ہوں کہ فیصلہ کس کے حق میں ہوتا ہے! اور راشد اس مجلس سے دور اپنے کمرے میں پلنگ پر نیم دراز آنکھیں بند کئے خیالوں میں گم تھا۔ لوگوں کے ذہنوں سے چند ماہ قبل کی وہ قیامت خیزیاں بھلا دینے کی کوششیں کرنے والا خود اس رات کی تباہ کاریوں کو نہ بھلا سکا تھا۔ اسے سب کچھ اس طرح یاد تھا جیسے سب کچھ گذشتہ

شب کو ہی ہوا ہو ــــــ

ــــ سب کچھ سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق ہوا تھا۔ ایک .... لڑکی کی آبروریزی کی فرضی کہانی گڑھ کر چند مفاد پرستوں اور سماج دشمن عناصر نے بستی میں خوف وہراس پھیلا دیا تھا۔ اور پھر ...... ایک شب باہر سے آئے کرائے کے غنڈوں اور شرپسندوں نے امن وشانتی کی بستی پر شب خوں مارا تھا۔ پوری بستی آگ اور خون میں ڈوب گئی تھی۔ دوکانیں لوٹی گئی تھیں۔ گھر لوٹے اور جلائے گئے تھے۔ بھالیوں اور برچھیوں کی انیاں کالے ناگوں کی زبانوں کی طرح لپلپانے لگی تھیں' انسانی خون چاٹنے لگی تھیں۔ دھماکے ہوتے رہے تھے۔ فضاؤں میں بارود کی مہک پھیلتی رہی تھی اور انسانیت چیختی رہی تھی' چلاتی رہی تھی ــــــ صبح ہونے اور ملٹری کے آنے تک ایک قیامت گزر گئی تھی ــــ اور جب دن کے اجالے میں حساب لگایا گیا تھا تو پتہ چلا تھا سب سے زیادہ نقصان ماسٹر رجب علی کے گھر کا ہوا۔ وہ شہید ہو گئے۔ ان کی بیوی رضیہ خاتون کے داہنے شانے میں ایک خنجر دور تک اتر گیا ہے اور ان کی بیٹی انجم اپنی حفاظت نہ کر سکی اور اب زخموں سے چور اپنی بے ہوش ماں اور دوسرے زخمیوں کے ساتھ ایمبولینس میں اسپتال لے جائی گئی ہے ــــــ ماضی کی یادوں نے راکھ تلے دبی چنگاریاں کریدیں تو چنگاریاں لہک اٹھیں۔ اس کا ذہن سلگنے لگا۔ مٹھیاں کس گئیں۔ ظالموں کو بھی رحم نہ آیا فرشتہ صفت ماسٹر رجب علی پر' ان کی ضعیف وناتواں بیوی پر' معصوم اور کمزور انجم پر ــــــ؟ اسی وقت قدموں کی آہٹ ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا۔ شاذیہ قریب کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"کیا ہے شاذیہ؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا

شاذیہ کی مسکراہٹ اور واضح ہو گئی۔ ایک ادا سے آگے بڑھی' دلبرانہ انداز سے بولی۔

"ہائے' آپ یہاں ہیں اور وہاں پوری انجمن آپ کی منتظر ہے۔ چلئے خالہ جان بلا رہی ہیں آپ کو!"

"کیوں؟"

"فیصلہ آپ پر چھوڑا گیا ہے!" شاذیہ پہلے تو اٹھلائی پھر شرما گئی۔

"کیسا فیصلہ؟" وہ شاذیہ کو تکنے لگا۔

"ہائے اللہ! میں کیا جانوں۔ آپ چلئے خود ہی جان جایئے گا!"

وہ لہراتی، بل کھاتی چلتی شاذیہ کے پیچھے چلتا بڑے ہال میں آیا۔ اس سے پہلے کہ اس کی ماں کچھ کہتیں، کانپور سے آئی نجمہ خالہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اپنے قریب بٹھالیا اور بولیں۔

"بیٹا راشد، راشدہ کی شادی تو ہو گئی۔ وہ اپنے گھر چلی گئی۔ اب آپا گھر میں اکیلی رہ گئی ہیں۔ برابر بیمار بھی رہتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اب تمہاری شادی بھی ہو جائے!"

اس نے کچھ نہ کہا تو خالہ بولیں۔ "سبھی قریبی رشتہ دار یہاں موجود ہیں اور ان کی لڑکیاں بھی۔ تم ان لڑکیوں میں سے کسی کو پسند کر لو۔ آپا کہتی ہیں راشد کی پسند میری پسند!"

اس نے لڑکیوں پر نظریں ڈالیں۔ نظریں نیچی کئے لڑکیاں تیز تیز سانسیں لے رہی تھیں۔ لڑکیوں کو شرماتے دیکھ کر خالو جان ہنسے۔ ہنستے ہنستے بولے:

"اتنی بھی بے حجابی کیا، راشد سبھی لڑکیوں سے واقف ہے۔ ان کی غیر موجودگی میں بھی اپنا فیصلہ سنا دے گا!" اور وہ لڑکیوں سے مخاطب ہوئے۔ "لڑکیوں، تم اپنے اپنے کمروں میں جاؤ!" سبھی لڑکیاں شرماتی، لجاتی اٹھیں اور ایک ایک کر کے ہال سے باہر نکل گئیں۔

"ہاں بیٹے اب کہو، کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟ کون پسند ہے تمہیں؟" خالہ جان نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔ وہ پھر بھی خاموش رہا تو خالو جان نے کہا۔ "یہ مت سوچو کہ تم فیصلہ کسی ایک کیلئے کرو گے اور باقی لوگوں کی دل شکنی ہوگی۔ یہاں تو سب اپنے ہیں سبھی لڑکیاں اپنی ہیں۔ لہٰذا کسی کی دل شکنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

اس نے اپنی ماں کو دیکھا تو وہ مسکرا کر بولیں۔ "تمہارے خالو ٹھیک ہی کہتے ہیں

راشد۔ سب اپنی ہی لڑکیاں ہیں۔ تم جسے پسند کروگے اسے اپنی بہو بنالوں گی!"

وہ باری باری تمام رشتہ داروں کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔

"یہ کانپور سے آئی نجمہ خالہ ہیں۔ یہ امی پر اور ان کی بیٹی شاذیہ مجھ پر ڈورے ڈال رہی ہے تاکہ میں اسے پسند کرلوں!"

"یہ عظیم آباد والی بڑی خالہ اور خالو ہیں۔ ان کی دیرینہ خواہش ہے کہ اپنی دبلی پتلی، مریل سی بیٹی کو مرے پلے باندھ دیں!"

"یہ چھوٹے ماموں ہیں۔ ماں کی خوشامد کرتے نہیں تھکتے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ماں ان کی ان پڑھ اور کند ذہن بیٹی کو بہو بنالیں!"

"یہ موتی پور سے آئی پھوپھی ہیں۔ مرحوم بھائی کا نام لے لے کر آج بھی روتی ہیں۔ اس رونے میں یہ غرض پوشیدہ ہے کہ میں ان کی سیاہ فام بیٹی کو اپنالوں!"

"یہ والد مرحوم کے چچازاد بھائی ہیں اور یہ ان کی بیگم۔ مری تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ میں ان کی دو آزاد خیال اور فیشن پرست لڑکیوں میں سے کسی ایک کو چن لوں!"

"اور یہ...... یہ..... یہ" اور اس نے اپنا فیصلہ سنادیا۔

"میں ابھی شادی نہیں کروں گا!"

"کیا؟" بہ یک وقت کئی زبانوں سے نکلا۔

"فی الحال میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں!" اس نے سر جھکالیا

"لیکن کیوں؟ اتنی لڑکیوں میں کوئی پسند نہیں آئی تمھیں؟" نجمہ خالہ بے چینی سے بولیں۔

"نہیں خالہ جان، بات یہ ہے کہ......!"

اس کی بات کاٹتے ہوئے نجمہ خالہ بولیں۔ "شاذیہ بھی پسند نہیں تمھیں؟" ان کا لہجہ خود غرضانہ تھا۔

"خالہ جان پسند اور ناپسند کی بات نہیں۔ میں ابھی.....!" اس کی بات

پھر از حد تھوڑی رہ گئی۔ نجمہ خالہ بپھر گئیں۔ "صاحبزادے نے تو کمال کر دیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک لڑکیاں ہیں یہاں اور اسے ایک بھی پسند نہ آئی!" پھر اس کی طرف مخاطب ہو کر دیدے نچاتے اور ہاتھ گھماتے ہوئے تنک کر بولیں۔

"اے ان لڑکیوں میں سے کسی سے نہیں کرے گا تو کیا اس چڑیل سے کرے گا شادی جسے دو دنوں تک رکھے رہا اپنے کمرے میں؟"

وہ چیخ پڑا۔ "خالہ جان کیچڑ مت اچھالیے کسی کی ذات پر!"

نجمہ خالہ بھلا اس سے کب پیچھے رہنے والی تھیں۔ اس سے اونچی آواز میں چیخیں "اے واہ! میں تو ہزار بار کہوں گی اسے چڑیل، آبرو باختہ!"

اس کا جی چاہا نجمہ خالہ کا منہ نوچ لے۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکا۔ وہ جس ماحول میں پیدا ہوا تھا، پلا اور بڑھا تھا اس ماحول کا تقاضہ یہی تھا کہ اپنے بڑوں کی تعظیم اور گھر آئے مہمانوں سے حسنِ سلوک کیا جائے۔ اس نے ضبط کرنے کی کوشش کی اور جب ضبط نہ کر سکا تو اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز تیز چلتا اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ ہال سے نکلتے ہوئے اس نے اپنی ماں کو کہتے سنا۔ نجمہ تمہیں ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا ہو سکتا ہے اتنے سارے لوگوں کے درمیان اپنی پسند ظاہر کرنے سے شرما رہا ہو!

اپنے کمرے میں آ کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں جیسے لمبی مسافت طے کر کے آیا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند ہوئیں تو ایک شبیہہ ذہن میں ابھرنے لگی۔ اداس سی، مضمحل سی، سوگوار سی۔ اور ایک نام اس کے ہونٹوں سے پھسل گیا ــــ انجم! اور وہ لوٹتا چلا گیا۔ ماضی کی طرف پیچھے ــــ بہت پیچھے ــــ

جب اس نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی تو ماں نے کہا تھا "بیٹے، تعلیم تو مکمل کر لی تم نے۔ اب ایک کام کر دو میرے۔ ایک بہو لا دو مجھے خوب صورت۔ گڑیا جیسی!" اور ہن بھی اس کے گلے سے جھول گئی تھی۔ "ہاں بھائی جان، امی ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھے بھی بھابی چاہیے، چاند جیسی!" اور ریاض نے اس کے کان میں چپکے سے کہا تھا۔ "اور کبھی

لگتی ہے آپ کو بھائی جان ؟" اور وہ چونک گیا تھا۔ جیسے راشدہ نے اس کے دن کا حال جان لیا ہو۔ اور جب راشدہ نے بار بار اپنا یہ سوال دہرایا تھا تو اس نے کہا تھا ــــ "اچھی ــــ بہت اچھی !" لیکن ــــ دوسرے ہی دن اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اس کے خوابوں کا محل جو انجم کے بغیر نامکمل تھا نامکمل ہی رہے گا۔ انجم اس کی دسترس سے دور ہے، بہت دور۔

ماں نے انجم کے گھر سے لوٹ کر بتایا تھا۔ انجم کے ابّو نے اس کی شادی بہت پہلے طے کر دی ہے اپنے بڑے بھائی کے بیٹے سے۔ اور اب شادی میں چند ہی ماہ باقی رہ گئے ہیں۔

اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے تو یہی سوچا تھا جب چاہے گا اس شگفتہ پھول کو اپنے گلدان میں سجائے گا۔ جب چاہے گا انجم کا ہاتھ ہمیشہ کے لئے اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ اس کے ہاتھ بڑھانے سے قبل انجم اس کی دسترس سے دور ہو جائے گی اور اسے مایوسیوں کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ مایوسیوں کے اسی عالم میں ایک دن جب انجم راشدہ سے ملنے آئی تھی تو اس نے انجم کو تنہا دیکھ کر کہا تھا۔" انجم ! میں تو تمہارے ساتھ پوری زندگی گزارنے کے حسین خواب دیکھا کرتا تھا۔ لیکن افسوس میرے سارے خواب مایوسیوں کے گہرے اندھیروں میں ڈوب گئے !"

انجم کچھ بولی نہیں تھی۔ جھکی ہوئی پلکوں کے نیچے لب تھرتھرا کر رہ گئے تھے۔ لیکن اس نے انجم کے نمناک ہوتے ہوئے پلکوں کو دیکھ لیا تھا۔

اور پھر وہ انجم سے دور رہنے لگا تھا۔ خود کو سمجھانے اور تسلی دینے لگا تھا ــــ اور چند ہی مہینوں بعد فساد کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔

رضیہ چچی مرتے مرتے اس زندگی کی طرف لوٹ آئی تھیں جو موت سے بھی زیادہ کربناک اور بھیانک تھی۔ انجم کے ظاہری زخم مندمل ہو گئے تھے۔ لیکن اندرونی

زخم ـــــ؟ وہ رضیہ چچی کے کام آتا رہا تھا۔ ان کے زخموں کو سہلاتا رہا تھا لیکن وہ انجم سے دور رہا۔ یہ سوچ کر ہی وہ مضطرب ہو جاتا تھا کہ کن لفظوں میں تسلی دے گا انجم کو؟ کیا کہے گا اس سے؟ اور کیسے آئے گی وہ اس کے سامنے؟ کیسے سامنا کر سکے گی اس کا؟ اور مہینوں بعد حزن و ملال کی اس زندہ تصویر کو اس نے شادی کے دن اپنے گھر میں دیکھا تھا اور مضطرب ہو اٹھا تھا۔

ایک ایک کر کے سارے مہمان چلے گئے۔ بھرا پرا گھر خالی ہوا تو بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ عجیب اداسی اور ویرانی چھا گئی تھی ہر طرف۔ راشدہ کے نہ ہونے سے اس کی ماں تنہا ہو گئی تھیں۔ اداس اداس، خاموش خاموش سی رہنے لگی تھیں۔ ایک دن دوپہر کے کھانے کے بعد کہنے لگیں۔

"بیٹے راشد! اب تو اور سونا سونا سا لگنے لگا ہے یہ گھر۔ ہر لمحہ تنہائی ڈستی رہتی ہے مجھے۔ راشدہ کے نہ رہنے سے تم بھی اکیلے رہ گئے ہو۔ کہو تو نجمہ کو خط لکھ دوں۔ کل ہی خط آیا اس کا۔ دعاؤں سے یاد کیا ہے تمھیں!"

وہ خاموش رہا تو ماں نے کہا: "نجمہ نک چڑھی سہی لیکن مزاج کی بری نہیں اس کی بیٹی شاذیہ اچھی لگتی ہے مجھے!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چھوٹی خالہ تو خفا ہو کر گئی ہیں مجھ سے!" اس کی ماں نے کہا۔ "وہ تو بچپن سے ہی ایسی ہے، ابھی خفا ہو گی ابھی من جائے گی!" تھوڑے توقف سے ماں نے کہا "بیٹا، تمھیں بھی برا نہ ماننا چاہیے اس کی باتوں کا۔ میری چھوٹی بہن ہے نادہ! بتاؤ کیا لکھ دوں نجمہ کو؟" وہ خاموش رہا تو ماں نے کہا۔ "تمھیں شاذیہ پسند نہیں تو نہ سہی جس سے کہے گا اسی سے کروں گی تیری شادی۔ یقین کر تیری پسند ہی میری پسند ہے!"

اس نے سر جھکائے ہوئے کہا۔ "امی! مجھے آپ کی تنہائی کا احساس ہے۔ جو بھی کوئی فیصلہ کر کے بتا دوں گا آپ کو!"

ـــ شام خوش گوار تھی۔ اسے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہو رہی تھی کہ وہ اپنے

مقصد میں کامیاب رہا ہے۔ چند دنوں قبل تک بستی پر چھائی ہوئی نفرت اور تعصب کی کثافت دھل گئی ہے۔ ہر چہرہ بشاش اور تازہ دم نظر آرہا ہے۔ ہر طرف پر مسرت چہل پہل ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے اس طرح مل رہے ہیں جیسے ان کے درمیان کبھی کوئی فرق نہیں تھا۔ کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ہر طرف امن ہی امن ہے، شانتی ہی شانتی ہے۔ وہ خوش ہوتا رہا، قدم آگے بڑھتے رہے۔

اور ___ اور اچانک اس کے قدم رُک گئے۔ اس نے سامنے دیکھا تو محسوس ہوا اداسیاں اور ویرانیاں بستی سے گئیں نہیں ایک مرکز پر سمٹ گئی ہیں۔ وہ بے چین ہو گیا۔ اف یہ گھر ___!

اور وہ اس گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ سہما سہما سا، ڈرا ڈرا سا! دروازہ بند نہیں تھا۔ اس نے کھلے ہوئے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹایا۔

"کون؟" اندر سے نحیف سی آواز آئی۔

"میں ___ میں ہوں چچی جان راشد!"

"آؤ بیٹے، اندر آجاؤ!"

اسے اس نحیف آواز میں اپنے پن اور خوشی کی آمیزش سی معلوم ہوئی۔ کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہو کر اندر بڑھتا چلا گیا۔ آنگن میں بچھے تخت پر بیٹھی رضیہ چچی چاول چن رہی تھیں۔ وہ ان کے قریب پہنچ کر تخت کے ایک کنارے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "دروازہ کھلا چھوڑ رکھا ہے آپ نے؟"

چاول کے دانوں کو کریدتی ہوئی رضیہ چچی کی انگلیاں رک گئیں۔ انھوں نے اسے دیکھا اور نظریں نیچی کرتی ہوئی مایوسانہ لہجے میں بولیں۔ "اب اس گھر میں بچا ہی کیا ہے جس کے لٹ جانے کا خوف ہو!"

وہ کانپ گیا۔ رضیہ چچی کے اس ایک جملے میں زمانے بھر کا درد سمٹ آیا تھا۔ اسے ندامت ہونے لگی۔ کیوں کہی اس نے ایسی بات۔۔۔!

وہ خاموش رہا تو رضیہ چچی نے پیچھے مڑ کر آواز دی۔ "انجم، بیٹی چائے تو لا۔۔

راشدہ کے لئے :"

" رہنے دیجئے، کیوں تکلیف دے رہی ہیں انجم کو!" اس نے ندامت کے احساس سے نکلنا چاہا۔

" نہیں بیٹے، مہینوں بعد تو آئے ہو اس گھر میں۔ کچھ کھائے پئے بغیر چلے جاؤ گے ؟" رضیہ چچی کا لہجہ محبت آمیز تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

" راشدہ کی کوئی خبر ملی ہے، کیسی ہے وہ سسرال میں؟" رضیہ چچی نے دریافت کیا

وہ پرسکون ہوتے ہوئے بولا۔" ہمارے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ بہت خوش ہے وہاں۔ بہت تعریف لکھی ہے اس نے اپنے سسرال والوں کی!"

رضیہ چچی لمبی سانس لیتے ہوئے بولیں۔" خوش نصیب ہے وہ لڑکی جسے اچھا سسرال ملے!" پھر تھوڑے توقف سے بولیں۔" بیٹے اب تمھاری شادی بھی ہو جانی چاہیئے۔ تمھاری ماں اکیلی رہ گئی ہیں گھر میں۔ سنا تھا تمھاری بجمہ خالہ بہت زور لگا رہی ہیں اپنی شاذیہ کے لئے؟"

" ہاں!" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

" تمھاری ماں کو پسند ہے شاذیہ؟" رضیہ چچی نے پوچھا

اس نے کہا:" امی کی اپنی کوئی پسند نہیں۔ میری پسند ہی ان کی پسند ہے"

" تو تمھیں پسند ہے شاذیہ؟ میں نے دیکھا ہے اسے اچھی لڑکی ہے!" رضیہ چچی مسکرائیں۔

" میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا اب تک۔ ایک اور لڑکی کی شادی ہو جائے پھر سوچوں گا اپنے بارے میں!" اس نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

" ایک اور لڑکی! کون ہے وہ؟" رضیہ چچی اسے تکنے لگیں۔

" انجم!" اس نے بلا تامل کہا۔

رضیہ چچی حیرت زدہ نظروں سے اسے تکنے لگیں۔ انھیں ایک ٹک ایسی

طرف دیکھتے پاکر وہ گھبرا گیا۔ بولا: "چچی جان، کیا انجم کے بارے میں مجھے سوچنے کا حق نہیں؟ کیا آپ کی ذمہ داریاں میری ذمہ داریاں نہیں ہیں؟"

رضیہ چچی رو پڑیں۔ انھیں روتا دیکھ کر وہ اور گھبرا گیا۔ "کیا ہوا؟ کیوں رونے لگیں آپ؟ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی کیا؟"

رضیہ چچی نے روتے ہوئے کہا۔ "بیٹا اب اور کون ہے ہمارا۔ انجم کی شادی ہوتی تو یہ تمام ذمہ داریاں تمھیں ہی سونپتی۔ لیکن اب اس کی شادی ہو گی ہی کہاں!"

"کیوں، کیوں نہیں ہو گی شادی؟ رشتہ تو ماسٹر چچا طے کر چکے ہیں، اپنے بڑے بھائی کے بیٹے سے۔ آپ کہیے تو میں چلا جاؤں لڑکے والوں کے یہاں۔ دن تاریخ مقرر کر آؤں شادی کی؟"

"اب کچھ نہ ہو گا بیٹا، کچھ نہ ہو گا!" رضیہ چچی کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔

وہ مضطرب ہو گیا۔ "سب کچھ ہو گا چچی جان۔ انجم کی شادی بھی اسی دھوم دھام سے ہو گی جس دھوم دھام سے راشدہ کی ہوئی ہے۔ آپ مجھ پر بھروسہ کیجیے۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا" اس کا لہجہ پر اعتماد تھا۔

رضیہ چچی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔ "جس لڑکے سے انجم کی شادی طے ہوئی تھی اس لڑکے کی شادی تو کب کی ہو چکی!"

"لیکن رشتہ تو انجم سے طے ہوا تھا نا؟" اس انکشاف نے اسے متحیر کر دیا۔

"ہاں، لیکن بستی میں ہونے والے فساد کے بعد لڑکے والوں نے شادی کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا تھا۔ انھیں اس کا بھی خیال نہ ہوا کہ لڑکی انھیں کے اپنے چھوٹے بھائی کی مجبور اور بے سہارا بیٹی ہے!"

"شادی سے انکار کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی؟" اس کی حیرت بدستور قائم تھی۔

رضیہ چچی رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو آنچل سے پونچھتے ہوئے بولیں۔ "انجم کے بارے میں جو بات پوری دنیا جانتی ہے وہ بات بھلا وہ کیسے نہ جانتے۔ لکھ بھیجا ہمیں ایسی لڑکی نہیں چاہیے جس کی ... ...!" رضیہ چچی کے آنسو پھر رواں ہو گئے۔

وہ حیران نظروں سے رضیہ چچی کو دیکھ رہا تھا کہ قدموں کی آہٹ ہوئی۔ دیکھا، انجم آرہی تھی۔ ہاتھوں میں چائے کی ٹرے سنبھالے، سر جھکائے، اپنے آپ میں سکڑی ہوئی، سمٹی ہوئی۔ وہ قریب آئی تو اس نے انجم کی آنکھوں میں دیکھا اور کانپ گیا "اُف! یہ آنکھیں ہیں یا رنج وغم کا، اداسیوں اور محرومیوں کا مسکن۔ اللہ کی پناہ! ایک مظلوم کی آنکھیں" اس نے دیکھا انجم کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ٹرے میں رکھی چائے کی پیالیاں کھنکھنا رہی تھیں۔ اس نے آگے جھک کر ٹرے انجم کے ہاتھوں سے لے لیا۔

"اب تو یہ دکھ مجھے کھائے جا رہا ہے کہ میرے بعد میری اس بد نصیب بچی کا کیا ہوگا؟ کون سہارا دے گا اسے؟ کیسے سہے گی یہ دنیا والوں کے طنز۔ طعنے؟ کہاں کہاں پناہ ڈھونڈتی پھرے گی یہ؟" رضیہ چچی کا لہجہ انتہائی کربناک تھا۔ آنکھوں سے اب بھی آنسو رواں تھے۔

بظاہر وہ خاموش تھا لیکن اس کے اندر ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ درد و کرب کے کتنے ہی نشتر اس کے دل میں دور تک اتر گئے تھے۔ عالم اضطراب میں پہلو بدلتے ہوئے اس نے کہا۔ "چچی جان، آپ کو یاد ہوگا بہت دنوں قبل میری امی آپ کے پاس آئی تھیں، آپ سے انجم کو اپنے لئے، میرے لئے مانگنے!"

"ہاں، یاد ہے مجھے۔ اتنے بڑے گھرانے کا رشتہ رد کرتے ہوئے ہمیں افسوس بھی ہوا تھا!" رضیہ چچی ایک بار پھر رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولیں۔ اس نے نہایت ہی متانت اور سنجیدگی سے کہا۔ "چچی جان، ایک بار پھر وہی بات دہرائی جائے تو......؟"

رضیہ چچی متحیر ہوگئیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو دیکھتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں بولیں: "یہ جانتے ہوئے کہ فساد کی رات انجم کی آبروریزی ہوئی تھی؟"

وہ مضطرب ہوگیا۔ اور چیخ پڑا۔ "یہ غلط ہے! انجم کی نہیں، آبروریزی ہمارے اس معاشرے کی کی گئی جو اپنے بے داغ ہونے کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ آبروریزی ہماری اس تہذیب کی ہوئی جو اپنے پاک دامن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے! انجم ـــــ انجم

تو کل بھی معصوم تھی، آج بھی معصوم ہے، مظلوم اور مجبور کو آبرو باختہ کون کہے گا ـــــ کون ـــــ؟"

رضیہ چچی کی پشت پر کھڑی انجم کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ سر تھام کر ایک طرف جھکی ہی تھی کہ اس نے لپک کر اسے تھام لیا۔

رضیہ چچی نے کچھ کہنا چاہا پر نہ کہہ سکیں۔ ان کے ہونٹ ہی نہیں پورا نحیف و ناتواں جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ ان کے شانے پر رکھ دیا۔

رضیہ چچی اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگیں جیسے ان کے لرزتے کانپتے وجود کو ہمالیہ سے اونچا، مستحکم اور کبھی نہ ٹوٹنے والا سہارا مل گیا ہو ـــــ!!

***

پردے جب اٹھ گئے ——— اور

اپنی آگ ——— کے بعد

شاکر کریمی کی تیسری کتاب

غم آشنا

(زیر طبع)

تقسیم کار:- ادب نکھار، متوناتھ بھنجن۔ یوپی

آپ چاہے ہندوستان کے جس حصہ میں بھی رہتے ہوں

اپنی کتابوں کی عمدہ کتابت، لیتھو اور آفسٹ کی بہترین طباعت کے لئے ہم سے رجوع کریں۔

اگر آپ چاہیں تو بذریعہ ڈاک صاف ستھرا مسودہ بھیجکر مکمل کتاب حاصل کر سکتے ہیں مگر مسودہ کے ساتھ اپنی خواہش کے مطابق ضروری ہدایات ضرور لکھیں۔

وقت کی پابندی ______ صاف ستھری کتابت، طباعت اور کفالت کے لئے ہماری خدمات حاصل کریں۔